REGD. L. NO.7243

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

# طلوعِ اسلام

مئی 1975

اِس پرچہ میں

## اقبالؔ اور ختمِ نبوّتؐ

ایک بصیرت افروز خطاب

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

# قرآن مجید سمجھ میں نہیں آسکتا

● — ترجموں سے کیونکہ قرآنی الفاظ کے مرادفات دنیا کی کسی زبان میں نہیں مل سکتے

● — تفسیروں سے کیونکہ تفاسیر میں عام طور پر مفسرین کے اپنے خیالات اور معتقدات قرآنی مطالب پر غالب آجاتے ہیں۔

● — قرآن مجید اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون کی مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔

مفکر قرآن پرویز صاحب نے چالیس سال کی محنت شاقہ سے پہلے اس قسم کا ایک لغات مرتب کیا اور اسکے بعد پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے متعین کیا ——— جو

## مفہوم القرآن

کے نام سے شائع ہو گیا ہے قرآن فہمی کے سلسلہ میں اس کی مثال کہیں نہیں ملے گی۔

● — مفہوم القرآن (معہ متن) موتیوں کی طرح ترشے ہوئے نستعلیق حروف میں بلاک کے ذریعے عمدہ سفید دبیز کاغذ پر چھاپا گیا ہے اور تین نہایت مضبوط خوبصورت مجلد جلدوں پر مشتمل ہے۔ ضخامت پندرہ سو صفحات۔

● — قیمت، جلد اول چھتیس روپے، جلد دوم چھتیس روپے، جلد سوم چالیس روپے، مکمل سیٹ ایک سو دس روپے

ملنے کا پتہ:

**ادارہ طلوع اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور**

**مکتبہ [illegible] و دانش - چوک [illegible] بازار - لاہور**

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

# طلوعِ اسلام

لاہور

| بدل اشتراک | ٹیلیفون | قیمت فی پرچہ |
|---|---|---|
| پاکستان<br>سالانہ —— پندرہ روپے<br>ممالک غیر<br>سالانہ —— ڈیڑھ پونڈ | ۸۰۸۰۰<br>خط و کتابت<br>ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی گلبرگ لاہور | (۱½)<br>ڈیڑھ روپیہ |
| جلد ۲۸ | مئی ۱۹۷۵ء | نمبر ۵ |

## فہرست

(۱) لمعات ———— ۳
(۲) اقبالؒ اور ختمِ نبوت ———— (محترم پرویز صاحب) ———— ۹
(۳) کیا مزارعت ناجائز اور مکان کا کرایہ ربوٰ ہے؟ ———— (شاہد عادل) ———— ۳۳
(۴) احوال و کوائف ———— (جشنِ عید میلاد النبیؐ) (مفکرِ قرآن کا دورہ گجرات) ۴۷
(۵) مجلسِ مذاکرہ ———— (طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۵ء) ———— ۴۹
(۶) مجلۂ مسعیٰ ———— (ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب) ———— ۶۰

ایڈیٹر محمد طفیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵-بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۱۔ اسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# لمعات

دین کے خلاف سب سے بڑی، موثر اور کامیاب سازش یہ ہوتی ہے کہ اسے مذہب میں تبدیل کر دیا جائے۔ ایک مسلمان اگر اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے تو وہ کافر کہلاتا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ اس کے برعکس، اگر وہ مسلمان رہتے ہوئے وہ سب کچھ کرے جسے مٹانے کے لئے دینِ خداوندی آیا تھا لیکن مذہب کے عقاید اور شعار کا پابند رہے تو نہ صرف یہ کہ وہ مسلمان کا مسلمان رہے گا بلکہ پکا دیندار، متقی، پرہیزگار، اور اس سے آگے بڑھ کر عالمِ دین، مثیلِ انبیاءِ بنی اسرائیل، وارثِ منبرِ رسول اللہ کہلائے گا۔ اور اگر وہ طریقت کی وادیوں کی طرف چلا جائے تو مقربِ بارگاہِ خداوندی تصور ہو گا اور محرمِ دین کا رمز آشنا۔ یہ اس لئے کہ مذہب کی تکنیک یہ ہے کہ وہ دینی عناصر کے پیکروں کو علیٰ حالہ رکھتا ہے لیکن ان سے دین کی روح نکال لیتا ہے۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ظہورِ قدسی کے وقت دینِ خداوندی کی یہی حالت ہو چکی تھی۔ وہ مختلف مذاہب میں تبدیل ہو کر اپنی معنویت اور حقیقت کھو چکا تھا۔ حضورؐ نے وحیٔ خداوندی کے مطابق دین کو اس کی حقیقی صورت میں متشکل کیا اور مذہب کے فریب کا پردہ چاک کر دیا لیکن کچھ عرصہ بعد اس دین کے خلاف بھی وہی سازش ہوئی اور یہ بھی مذہب میں تبدیل کر دیا گیا۔ ہم صدیوں سے اسی مذہب کے پرستار چلے آ رہے ہیں۔ مذہب کی اس تکنیک کو پرویز صاحب نے سلیم کے نام خطوط" کے ایک خط میں (جو اس مجموعہ کی جلد اول میں شامل ہے) ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

"میں نے اپنے گزشتہ سفرِ بلوچستان میں ایک جگہ دیکھا کہ ایک ویران سی بستی کے قریب کچھ ٹوٹی پھوٹی عمارات ہیں۔ ایک طرف ریلوے سگنل کا ٹوٹتا ہوا کھمبا ایستادہ ہے۔ دوسری طرف ریل کا کانٹا موڑنے کا چکر ہے۔ ذرا فاصلے پر ریل کی پٹڑی کے دو چار ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔ گاؤں کے ایک بوڑھے نے بتایا کہ پہلے یہاں ریل کا اسٹیشن تھا۔ ہماری بستی اناج اور پھلوں سے بھری رہتی تھی۔ آنے جانے والے مسافروں کی وجہ سے بڑی رونق رہتی تھی اور بستی کے لوگ خوشحال تھے۔ اب یہاں سے ریل اٹھا دی گئی ہے جس کی وجہ سے یہ بستی نہیں، ویرانہ ہے اور ہمارے دن بڑی مشکل سے گزرتے ہیں۔ اس بڈھے نے ریل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لیکن اس کی ایک دو پشتوں کے بعد جو بچے پیدا ہوں گے وہ اپنے ماں باپ سے ریل کی کہانیاں سنیں گے۔ اس کی برکات کے قصے سن کر وہ ریل کے متعلق عجیب سا تصور قائم کریں گے۔ ریل کی جگہ وہ ان ٹوٹے ہوئے

کھمبوں اور بکھری ہوئی پٹڑیوں کے نشانات دیکھیں گے۔ چونکہ انہوں نے ریل دیکھی نہ ہوگی اس لئے وہ یہی سمجھ بیٹھیں گے کہ وہ برکتیں انہی کھمبوں اور پٹڑیوں کے ٹکڑوں سے وابستہ تھیں۔ اس لئے وہ ان نشانات کی بڑی حفاظت کریں گے۔ انہیں پینٹ کرتے رہیں گے۔ انہیں بڑے مقدس سمجھیں گے۔ کیونکہ ان کا عقیدہ یہ ہوگا کہ اسی سے وہ خوشحالیاں اور شادابیاں دوبارہ حاصل ہو سکیں گی جن سے وہ محروم ہو چکے ہیں۔

مذہب پرست قوم کی یہ کیفیت صرف دین کے معاملے میں ہی نہیں ہوتی، ان کی ذہنی افتاد ہی ایسی ہو جاتی ہے۔ ان کے سامنے کوئی حقیقت بھی آئے وہ اس کا مجسمہ تراش لیتے ہیں اور اس حقیقت کو پس پشت ڈال کر اس مجسمہ کی پرستش شروع کر دیتے ہیں اور پھر آنے والی نسلیں اسی مجسمہ کو حقیقت سمجھ لیتی ہیں۔ ہمارے ہاں اس کی تازہ ترین مثال علامہ اقبال ہیں۔ اقبالؒ نے ایک فکر پیش کی، ایک پیغام دیا۔ قوم کے سامنے ایک نصب العین رکھا جس کی بدولت وہ پاکستان جیسی مملکت کی وارث بن گئی۔ لیکن اس کے بعد نہ اقبالؒ کی فکر باقی رہی نہ اس کا پیغام۔ نہ اس کی نشان کردہ منزل نگاہوں کے سامنے رہی نہ اس کا متعین کردہ نصب العین۔ اقبالؒ کا ایک مجسمہ تراشا گیا اور اس کی پرستش شروع کر دی گئی۔ اس مملکت میں اقبالؒ کی فکر اور پیغام کی اعلانیہ، مسلسل اور متواتر مخالفت ہو رہی ہے لیکن اس کے مجسمہ کی پرستش اس دھوم دھام سے کی اور کرائی جا رہی ہے کہ قوم اسی بے روح مجسمہ کو اقبالؒ سمجھنے لگ گئی ہے۔ یہ اسی قسم کی سازش ہے جس قسم کی سازش دینِ خداوندی کو مذہب میں بدلنے کے لئے اختیار کی گئی تھی۔

اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے ۱۹۳۰ء میں کہا تھا کہ:-

> ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے...... اس سے اسلام اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں دورِ حاضر کی روح کے قریب تر لا سکنے کے قابل بن سکے گا...... اس سے اسے ایسا موقعہ میسر آ جائے گا جس سے یہ اس کٹھپہ کو مٹا سکے گا جو عرب ملوکیت نے زبردستی اس پر لگا رکھا ہے۔
>
> (خطبہ صدارت الٰہ آباد)

اس مقصد کے حصول کی جدوجہد کے سلسلہ میں انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے اعتراض کے جواب میں فرمایا تھا:-

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریزی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں۔ بلکہ ہمارا اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائیں۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل

کوشش کرو دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر اب ہے ایسا ہی رہے، یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ میں ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا، سب حرام سمجھتا ہوں قطعاً حرام۔

(معرکۂ دین و وطن)۔

ہم پوچھنا چاہتے ہیں ارباب بصیرت سے کہ کیا اس اٹھائیس سال کے عرصہ میں یہ مملکت اس نصب العین کے قریب تر ہوئی ہے جس تک پہنچنے کے لئے اقبالؒ نے اس کا تصور پیش کیا تھا، یا یہ انگریز کے زمانے سے بھی اس سے دور تر ہو گئی ہے۔ جب صورت یہ ہے تو پھر سوچیئے کہ اس دھوم دھام سے اقبالؒ کی یاد میں منانا، اس کے پیکرِ بے روح کی تزئین و آرائش اور اس کے مجسمے کی پرستش نہیں تو اور کیا ہے؟ اور پھر کیا اس تمام تزئین و آرائش کا نتیجہ یہ نہیں نکل رہا کہ اقبالؒ کی پیش کردہ حقیقت اسی شور و غوغا میں گم ہوتی چلی جا رہی ہے۔

انگریزی غلامی کے دور میں، اقبالؒ نے مسلمان سے کہا تھا کہ:-

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

"سلطانی" کی بات تو ہم بعد میں کریں گے، پہلے آپ "ملائی و پیری" کو لیجئے اور ان دونوں میں بھی پہلے "ملائی" کو سامنے لے آئیے۔ ہمارے ہاں اعداد و شمار تو رکھے نہیں جاتے لیکن یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جو اپنی شہادت کے لئے اعداد و شمار کی محتاج نہیں۔ تقسیم ہند کے وقت اس خطۂ زمین میں جس قدر مذہبی مکاتب اور دارالعلوم تھے ان کی تعداد کو ذہن میں لائیے اور اس کے بعد دیکھئے کہ آج ان کی کثرت کا کیا عالم ہے۔ اس سے صاف نظر آ جائے گا کہ مملکت پاکستان میں "ملائیت" کو کس قدر فروغ حاصل ہوا ہے۔ اقبالؒ نے ملائیت کے خلاف جس شرح و بسط سے لکھا ہے اسے تفصیلاً سامنے لانے کی اس وقت گنجائش نہیں۔ جو کچھ یہاں مذہب کے نام پر پیش کیا جاتا ہے، اس کی حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لئے سردست "ساقی نامہ" کے یہ دو شعر کافی ہوں گے کہ

شریعت، طریقت، تصوف، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

اب ظاہر ہے کہ اقبالؒ کے نقطۂ نگاہ سے ان چیزوں کو جس قدر فروغ ہو گا، اسی قدر حقیقت خرافات میں گم ہوتی چلی جائے گی۔

اقبالؒ نے ملا کے درکِ سیاست کے متعلق کہا تھا کہ:-

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا جانیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

غیر منقسم ہندوستان میں ان حضرات کا منصب "دو رکعت کی امامت" سے زیادہ کچھ نہ تھا، لیکن اسی اقبالؒ کے عطا کردہ تصورِ مملکت میں انہیں جو مناصب بلند عطا ہوتے ہیں وہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ یہ صوبوں

کی وزارت نے علماء کی مسندوں پر بھی متمکن ہوتے اور اب خود مرکزی حکومت میں مذہبی امور سے متعلق ایک وزارت کا قیام بھی عمل میں آچکا ہے۔ اور ستم ظریفی یہ کہ خود حکومت کے زیر اہتمام یہ حضرات اقبالؒ کی یاد میں منانے کی تقاریب میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ ہم اپنی طرف سے تو کچھ نہیں کہنا چاہتے لیکن آپ سوچئے کہ اگر آج اقبالؒ زندہ ہوتا تو اس کے ساتھ جو مذاق کیا جا رہا ہے وہ اسے کبھی برداشت کر سکتا؟

شریعت سے آگے بڑھ کر طریقت کو لیجئے۔ اس طریقت کے خلاف اسلام ہونے کے متعلق بھی اقبالؒ نے جو کچھ کہا ہے اس کی تفصیل میں جانے کے لئے وقت نہیں۔ "ارمغان حجاز" ان کی فکر کی آخری مظہر ہے۔ وہ تو شائع بھی ان کی وفات کے بعد ہوئی تھی۔ "ابلیس کی مجلس شوریٰ" اس کی ایک ایسی نظم ہے جس میں اسلام کی سرگذشت، ابلیس دہر کی طرف سے اس کی مخالفت اور دین کو اس کی اصلی شکل میں ابھرنے نہ دینے کے لئے گوناگوں سازشیں جس موثر اور بلیغ انداز میں ہویدا کی گئی ہیں کہ خود اقبالؒ کے کلام میں بھی یکجا اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے آخری حصہ میں ابلیس نے کہا ہے کہ مجھے اور کسی بات سے کوئی پریشانی نہیں۔ مجھے پریشانی ہے تو یہ کہ عصر حاضر کے تقاضوں سے

ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبرؐ کہیں!

اس کے مشیروں نے پوچھا کہ اس خطرہ سے محفوظ رہنے کے لئے ہمیں کرنا کیا چاہیئے۔ اس نے کہا کہ کرنے کا کام بس ایک ہی ہے۔ اگر تم نے ایسا کر دیا تو پھر خطرہ کی کوئی بات نہیں۔ پھر دین کبھی آشکارا نہیں ہو سکے گا اور وہ کرنے کا کام یہ ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

آپ سوچئے کہ تصور اقبالؒ کی عطا کردہ اس مملکت میں یہ ابلیسی پروگرام کس قدر کامیاب ہوا۔ اس وقت سارا ملک تکیوں، داتروں، مزاروں، درگاہوں، خانقاہوں سے اٹ چکا ہے۔ خانقاہیت کے وہ کھنڈرات جو مرور زمانہ سے خود بخود مٹتے چلے جا رہے تھے، انہیں نہ صرف یہ کہ از سر نو زندہ کیا جا رہا ہے بلکہ انہیں اس قدر جاذب اور دلکش بنایا جا رہا ہے کہ لوگ ان کی طرف کشاں کشاں، رقصاں وجنباں، ہجوم در ہجوم، انبوہ در انبوہ لپکے چلے آتے ہیں۔ اور سال کا کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس میں ان کی رونق میں کوئی کمی آتی ہو۔ اور ستم بالائے ستم کہ یہ سب کچھ خود مملکت کے زیر اہتمام لاکھوں کروڑوں روپیہ کے صرف سے انجام پاتا ہے اور قیامت یہ کہ یادگار اقبالؒ کی محفلیں بھی انہی مراکز میں جمائی جاتی ہیں۔ اور اب تو خانقاہوں سے آگے بڑھ کر یہ کام حکومت کے ذرائع ابلاغ کی وساطت سے بڑے زور وشور سے لیا جاتا ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی پر اقبالؒ کے نشید کا مستوانہ شکل وصورت کے بیکر جس قصابیت سے کلام اقبالؒ کا جھٹکا کرتے ہیں اور معانی تو بہت دور کی بات ہے، اس کے الفاظ تک کو مسخ کرتے ہیں اس سے اقبالؒ کی روح تڑپ تڑپ اٹھتی ہوگی۔ یہ ہے وہ انداز جس سے اقبالؒ کی یاد میں منائی جاتی ہیں۔

اقبالؒ کی ساری زندگی اس جہاد میں گزری کہ اسلام کی رو سے قومیت کی تشکیل کا معیار دین کا اشتراک

ہے کہ وطن کا اشتراک یعنی کسی ایک ملک میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد قرار نہیں پا سکتے یہ دو الگ الگ قومیں ہوتی ہیں۔ اسی کو دو قومی نظریہ کہتے ہیں اور اسی نظریہ کو منوانے سے یہ مملکت وجود میں آئی تھی۔ اب اس مملکت کو لیجئے۔ اس میں چار چار قوموں کے نظریہ کے علمبرداروں کو تو چھوڑیئے، جو لوگ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، دو قومی نظریہ کے الفاظ کی رٹ لگاتے رہتے ہیں، ان سے پوچھیئے کہ کہ وہ کون سی دو قومیں ہیں جو اس ملک میں بستی ہیں۔ آپ نے تو آئینی طور پر ملک میں بسنے والے مسلموں اور غیر مسلموں کو ایک قوم قرار دے رکھا ہے۔ سوچئے کہ جب یہاں اقبالؒ کے پیش کردہ بنیادی تصور کی یہ درگت بنائی جا رہی ہے تو پھر اسی اقبالؒ کی یاد میں منانا، اس کے منہ پر طمانچہ مارنا نہیں تو اور کیا ہے؟

جہاں تک سیاسیات کا تعلق ہے، علامہ اقبالؒ نے واضح طور پر کہا تھا کہ:۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ اقبالؒ کی نگہ بصیرت تھی جس نے اس حقیقت کو بے نقاب کیا کہ مغرب کا جمہوری نظام ملوکیت ہی کی ایک نقاب پوش شکل ہے۔ چنانچہ انہوں نے بہت پہلے کہا تھا:۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

ملوکیت کیا ہے؟ ایک شخص اپنے فیصلہ کو قوم سے بزور منواتا ہے۔ اور مغربی نظامِ جمہوریت کیا ہے؟ یہی کہ ایک کی بجائے دس بیس یا سو پچاس انسان اپنے فیصلوں کو قوم سے منواتے ہیں۔ البتہ ان فیصلوں کا تمام آئین و قوانین رکھ لیتے ہیں۔ دین خداوندی نے کہا تھا کہ انسان ایک ہو یا دس ہزار۔ کسی کو بھی حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنے فیصلوں کو منوائے۔ اطاعت صرف خدا کے فیصلوں کی کیجائے گی اور یہی کفر اور اسلام میں خطِ امتیاز ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝ جس نظام میں فیصلے خدا کی کتاب کے تابع نہیں ہوتے، اسی کو کفر کہا جاتا ہے۔ اس حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن  نیست ممکن جز بقرآں زیستن

آپ سوچئے کہ کیا مملکت پاکستان میں مغرب کا وہی جمہوری نظام نافذ العمل نہیں چلا آ رہا جسے مٹانے کے لئے اقبالؒ نے اس مملکت کا تصور دیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس مملکت کے آئین میں "کتاب وسنت" اور "حدود اللہ" کے الفاظ ضرور درج ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت تو انہی سگنل کے کھمبوں اور ریلوے لائن کی پٹڑی کی سی ہے جس کی مثال شروع میں دی جا چکی ہے۔ فرمایئے کہ جس مملکت میں کاروبارِ شہریاری کی نوعیت

نہ ہو اس میں اقبالؒ کی یاد منانا (اقبالؒ کے مجسمہ کی پرستش نہیں) تو اور کیا ہے

اقبالؒ نے حکومتِ خداوندی اور ملوکیت میں ایک فرق یہ بھی بتایا تھا کہ ملوکیت میں ذرائع پیداوار انسانوں کی ملکیت میں سمجھے جاتے ہیں اور نظامِ خداوندی میں یہ خدا کی ملکیت قرار پاتے ہیں۔ "ملکیت" کا مفہوم سمجھنے کی چیز ہے۔ جب فرعون نے کہا تھا کہ — أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي (۴۳/۵۱) کیا اس ملک کی زمین اور اس میں بہنے والے دریا میری ملکیت نہیں، تو اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ اس نے اس زمین اور ان دریاؤں کو کسی بکس میں مقفل کر کے اس کی چابی اپنے پاس رکھ لی تھی۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ ان ذرائع سے حاصل ہونے والی پیداوار میری مرضی کے مطابق صرف ہوگی۔ آپ سوچئے کہ دورِ حاضر کی خدا فراموش سیکولرزم یہی بات نہیں کہتی جو بات فرعون نے کہی تھی۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہاں کہنے والا ایک فرد تھا اور اب وہی بات کہنے والا وہ گروہ ہوتا ہے جو برسرِ اقتدار آجاتا ہے۔ وہ بھی یہی کہتا ہے کہ ان ذرائع سے حاصل شدہ پیداوار ہماری مرضی کے مطابق صرف ہوگی۔ اس کے برعکس دینِ خداوندی کا اعلان یہ ہے کہ ان ذرائع سے حاصل کردہ رزق نہ کسی ایک انسان کی مرضی کے مطابق صرف میں لایا جائے گا، نہ انسانوں کے کسی گروہ کی مرضی کے مطابق۔ یہ صرف میں لایا جائے گا کتابِ خداوندی کے فیصلوں کے مطابق نوعِ انسان کی ربوبیتِ عالمینی کے لئے۔ آپ سوچئے کہ جس مملکت میں یہ نظام رائج نہ ہو اس میں اقبالؒ کی یاد منانا خود فریبی یا فریب دہی سے زیادہ کیا ہے۔ اور اب تو اس ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ خود اقبالؒ کو سوشلسٹ کہا جا رہا ہے۔ اچھا ہی ہوا کہ اقبالؒ یہ دن دیکھنے کے لئے دنیا میں نہ رہے۔

اب تک اقبالؒ کی یادیں منتشر طور پر منائی جاتی رہی ہیں۔ اب فیصلہ ہوا ہے کہ دو سال کے بعد اقبالؒ کی پیدائش کا جشنِ صد سالہ خود حکومت کے زیرِ اہتمام ملک گیر حیثیت سے منایا جائے گا۔ اس عظیم تقریب کے اہتمام کے لئے ایک بڑی وسیع کمیٹی کی تشکیل کی گئی ہے۔ جب ہم اس کمیٹی کے ارکان کے بعض ناموں کو سامنے لاتے ہیں تو ہمیں بے اختیار قرآن کی ایک تنبیہ یاد آجاتی ہے۔ اس نے کھلے الفاظ میں کہا تھا کہ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَن يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللَّهِ (۹/۱۷) کسی مشرک کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ مساجدِ خداوندی کی تعمیر، آبادکاری، انتظام، اہتمام یا تزئین و آرائش میں حصہ لے۔ اس نے کہا تھا کہ اس کا حق صرف انہی کو پہنچتا ہے — مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ ..... (۹/۱۸) جو خدا کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہوں۔ ہم اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ اگر مشرک خانۂ کعبہ یا دیگر مساجد اللہ کی آبادکاری میں شریک ہو جائیں تو اس سے دین کو کیا نقصان پہنچتا ہے۔ اس وقت ہم (موضوعِ زیرِ نظر کی نسبت سے) صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ جو لوگ "یا تو سرے سے اقبالؒ کی پیش کردہ قرآنی فکر کو تسلیم ہی نہیں کرتے اور یا اسے تسلیم کرتے ہیں تو اس انداز سے کہ اس میں غیر اسلامی "ازم" کی بھی آمیزش کر دیتے ہیں؛ اگر انہوں نے فکرِ اقبالؒ پر کتابیں لکھیں اور پیغامِ اقبالؒ کی تشریح کی، اور یہی تصانیف فکر و پیامِ اقبالؒ کی مستند شرح قرار پا کر دنیا میں عام ہو گئیں تو اس کے بعد فکر و پیامِ اقبالؒ کو صفحۂ ہستی سے محو کرنے

کے لیے کسی اور کوشش اور کاوش کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اقبالؒ نے اپنے متعلق خود کہا تھا کہ

گر دلم آئینہ بے جوہر است ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموس فکرم چاک کن ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

لہٰذا، اقبالؒ کی یاد منانے کی کوئی کوشش یا اس کی فکر و پیام کی نشر و اشاعت کے لیے کوئی کاوش جو قرآن سے ہٹ کر کی جائے گی وہ خود اقبالؒ کی منشاء کے خلاف ہوگی۔ اور اس کا نتیجہ اقبالؒ کی فکر کو مسخ شدہ صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔ دین کے دشمنوں اور اقبالؒ کے مخالفوں کا یہی مقصد ہے۔

کہ ہم توقع کریں کہ اربابِ اقتدار ہماری ان گزارشات کو درخورِ اعتنا قرار دیں گے؟

## ۲۔ لڑکیوں کے والدین متوجہ ہوں

طلوعِ اسلام کی سالہا سال کی تگ و تاز کے بعد عورتوں کو جو تھوڑے بہت حقوق حاصل ہوئے وہ حکومت کے "عائلی قوانین" میں درج ہیں۔ ان میں ایک اہم شق وہ ہے جو نکاح نامہ کے فارم میں خانہ ۱۸ میں درج ہے۔ اس میں کہا گیا ہے۔

۱۸۔ کیا شوہر نے طلاق کا حق بیوی کو تفویض کر دیا ہے۔ اگر کر دیا ہے تو کون سی شرائط کے ماتحت۔

اس کالم کے سامنے (دلہا کی رضامندی سے) واضح الفاظ میں لکھنا چاہیئے۔

بلا شروط تفویض کر دیا گیا۔

اس سے لڑکی کا ایک اہم حق محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ لڑکی کے والدین یا سرپرست اس باب میں احتیاط نہیں برتتے۔ نکاح نامہ کا فارم نکاح خوان (مولوی صاحب) کو دے دیتے ہیں اور وہ (بغیر کسی سے پوچھے) اس کالم کے سامنے کراس (×) کا نشان لگا دیتا ہے جس سے یہ بچی (جو اس وقت، ہمارے رواج کے مطابق، خاموش اور بے بس سی ہوتی ہے) اپنے اتنے سے حق سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔ ازاں بعد، جب (سوءِ اتفاق سے) میاں بیوی میں تنازعہ پیدا ہوتا ہے تو مظلوم بیوی حصولِ طلاق کے لیے عدالتوں کی خاک چھانتی اور در بدر دھکے کھاتی پھرتی ہے۔ اس وقت اس کے لواحقین کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ نکاح کے وقت ان کی ذرا سی غفلت نے کیا نتائج پیدا کر دیئے۔

نکاح کے وقت، بچی کے حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری اس کے والدین یا سرپرستوں پہ عاید ہوتی ہے۔ لہٰذا، ان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ نکاح نامہ میں کالم ۱۸ کا جواب، نہایت احتیاط سے لکھیں یا لکھوائیں اور اس کا اطمینان کر لیں کہ "مولوی صاحب" اس باب میں کوئی گڑبڑ نہ کرنے پائیں۔ یہ لوگ اکثر کہہ دیتے ہیں کہ یہ کالم خلافِ شریعت ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ یہ کالم مطابقِ شریعت بھی ہے اور مطابقِ قانون بھی جسے حکومت نے خود اپنے نافذ کردہ نکاح ناموں کے فارم میں درج کر رکھا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اقبالؒ اور ختمِ نبوّت

بتقریب یومِ اقبالؒ اپریل ۱۹۷۵ء

پروِیز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اقبالؒ اور ختمِ نبوتؐ

پرویز

عزیزانِ گرامی قدر۔ السلام علیکم!

امسال یومِ اقبالؒ کی تقریب کے لئے جو موضوع تجویز کیا گیا ہے، میرے نزدیک حالات کی مناسبت سے وہ نہایت موزوں ہے۔ ایک تو اس لئے کہ ختمِ نبوت دین کی اساس و بنیاد ہے اور دوسرے اس بنا پر کہ علامہ اقبالؒ نے جس طرح پاکستان کا تصور دے کر مسلمانانِ ہند کی جدوجہدِ آزادی کے لئے ایک نصب العین متعین کر دیا، اسی طرح انہوں نے عقیدۂ ختمِ نبوت کی اہمیت اور عظمت کی وضاحت سے اس تحریک کو بھی نشانِ منزل عطا کر دیا۔ حضرت علامہؒ کے یہ کتنے بڑے احسانات ہیں کہ ان کی یاد قائم رکھنا قوم کا ملّی فریضہ ہے، اس لئے بھی کہ خود اس کی دینی زندگی کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔

آجکل اس افتراء کو فضا میں عام کیا جا رہا ہے کہ علامہ اقبالؒ مرزا غلام احمد کے دعویٰ کی صداقت کے قائل تھے اور ان کی جماعت کی حقانیت کے معترف۔ احمدی حضرات کا یہ عام شعار ہے کہ یہ تلبیس سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنے امام (مرزا غلام احمد) کی تحریروں سے چن چن کر وہ عبارتیں پیش کریں گے جن میں مرزا صاحب نے اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں مسلمانوں جیسے عقاید و نظریات کی تلقین کی تھی۔ اور ان کی انبار در انبار ان تحریروں کو کبھی سامنے نہیں لائینگے جن کی رُو سے انہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور تمام مسلمانوں کو خارج از اسلام قرار دے کر اپنی الگ امت کی تشکیل کی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۱۱ء میں علیگڈھ یونیورسٹی میں ایک تقریر کی تھی جس کا اردو ترجمہ "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا:۔

> میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سایہ عالمگیر کی ذات نے ڈالا ہے، بیشک اسلامی سیرت کا نمونہ ہے اور ہماری تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہئے کہ اس نمونہ کو ترقی دیجائے اور مسلمان ہر وقت اسے پیشِ نظر رکھیں۔ پنجاب میں اسلامی سیرت کا کھٹیا نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔

## علامہ اقبال کا اظہارِ حقیقت

"احمدی" حضرات اس اقتباس کو ہر جگہ اچھالتے پھرتے ہیں اور اسے اپنے امام کے دعویٰ کی صداقت کے لئے بطور سند پیش کرتے ہیں اور کبھی یہ نہیں بتاتے کہ خود علامہ اقبالؒ نے اس عبارت کے متعلق کیا کہا تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے یہ تقریر میں نے ۱۹۱۱ء یا اس سے قبل کی تھی۔ اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے (یعنی ۱۹۳۵ء سے) ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ اس تقریر سے بہت پہلے مولوی چراغ علی مرحوم نے جو مسلمانوں میں کافی سربرآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے، بانی تحریک کے ساتھ تعاون کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کتاب "براہین احمدیہ" میں بیش قیمت مدد پہنچائی لیکن مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لئے برسوں چاہئیں۔ تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانی تحریک کے ساتھ ذاتی ربط رکھتے تھے۔ معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائیگی۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت ــــ بانیٔ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت ــــ کا دعوےٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن: اپنے آپ کو صرف پتھر جھٹلا نہیں سکتے۔　　(احمدیت اور اسلام)

مفکرین کی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ جوں جوں ان کے علم میں وسعت اور فکر میں گہرائی پیدا ہوتی ہے، وہ اپنے سابقہ خیالات پر نظرِ ثانی کر کے ان میں تبدیلی ... کرتے رہتے ہیں۔ یہ تو صرف خاصۂ نبوت ہے کہ اس کا پیغام روزِ اول سے آخری دن تک یکساں اور واحد رہتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اس پیغام کا سرچشمہ علمِ خداوندی ہوتا ہے جو زمان اور مکان کی حدود سے ماورا اور ہر آن بدلنے والے احوال و کوائف کی اثر پذیری سے منزہ و معرا ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی تقریر کے متعلق جو وضاحت کی ہے اس کے علاوہ خود "احمدی" حضرات کے ہاں سے بھی ایک ایسی شہادت ملتی ہے جس کی رو سے ان حضرات کا یہ دعویٰ کہ علامہ اقبالؒ بھی قادیانیت کی صداقت کے معترف تھے پاش پاش ہو جاتا ہے۔ مرزا غلام احمد کے بیٹے مرزا بشیر احمد نے "سیرت المہدی" کے عنوان سے اپنے والد کے سوانح حیات قلمبند اور شائع کئے ہیں۔ وہ اس میں

لکھتے ہیں کہ:-

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ جو سیالکوٹ کے رہنے والے تھے، ان کے والد کا نام شیخ نور محمدؒ تھا ..... شیخ نور محمدؒ صاحب نے غالباً ۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء میں مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم اور سید حامد شاہ صاحب مرحوم کی تحریک پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام (مرزا غلام احمد قادیانی) کی بیعت کی تھی۔ ان دنوں سر محمد اقبالؒ اسکول میں پڑھتے تھے اور اپنے باپ کی بیعت کے بعد وہ بھی اپنے آپ کو احمدیت میں شمار کرتے تھے اور حضرت مسیح موعود کے معتقد تھے۔ چونکہ سر اقبالؒ کو بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا اس لئے ان دنوں میں انہوں نے سعداللہ لدھیانوی کے خلاف حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تائید میں ایک نظم بھی لکھی تھی۔ مگر اس کے چند سال بعد جب سر اقبالؒ کالج میں پہنچے تو ان کے خیالات میں تبدیلی آگئی اور انہوں نے اپنے باپ کو سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔ چنانچہ شیخ نور محمدؒ صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں یہ تحریر کیا کہ ..... آپ میرا نام اس جماعت سے الگ رکھیں۔ اس پر حضرت صاحب کا جواب میر حامد شاہ صاحب مرحوم کے نام گیا جس میں لکھا تھا کہ شیخ نور محمد کو کہہ دیں کہ وہ جماعت سے ہی الگ نہیں بلکہ اسلام سے بھی الگ ہیں ..... ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ اپنی زندگی کے آخری ایام میں (احمدیت کے) شدید طور پر مخالف رہے اور ملک کے نو تعلیم یافتہ طبقہ میں احمدیت کے خلاف جو زہر پھیلا ہوا ہے اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر سر اقبالؒ کا مخالفانہ پروپیگنڈا تھا۔

(سیرت المہدی جلد سوم صفحہ ۲۴۹ - طبع اول اپریل ۱۹۳۹ء)

میں ان بیانات کے تنقیدی جائزہ سے صرف نظر کرتے ہوئے، کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ "احمدی" حضرات علامہ اقبالؒ کی ۱۹۱۱ء کی تقریر کے ایک فقرہ کو تو اچھالتے پھرتے ہیں لیکن نہ ان کی طرف سے پیش کردہ وضاحت کا کبھی ذکر کرتے ہیں اور نہ ہی خود مرزا صاحب کے صاحبزادہ کی اس شہادت کو سامنے لاتے ہیں۔ یہ ہے ان کے تلبیسی پراپیگنڈے کے انداز کی ایک مثال۔

علامہ اقبالؒ کی طرف سے تحریک "احمدیت" کی اس (بقول مرزا بشیر احمد) زہر آلود مخالفت کی ابتدا ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ اور یہیں سے میں بھی اس داستان کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس کی تمہید کے طور پر ایک اور واقعہ کا پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اسے پیش کرتے وقت مجھے کچھ جھجک سی محسوس ہوتی ہے کیونکہ ذکر علامہ اقبالؒ کا ہو رہا ہے اور اس واقعہ کا تعلق خود میری اپنی ذات سے۔ لیکن اس کی اہمیت کا تقاضا اس جھجک پر غالب آجاتا ہے اور اس جرأت کا کفارہ بن جاتا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۲۶ء کی بات ہے کہ سابق ریاست بہاولپور کی ایک عدالت میں ایک مقدمہ دائر ہوا جس میں ایک مسلمان خاتون نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کے خاوند نے قادیانی مسلک اختیار کر لیا ہے جس کی وجہ

## بہاول پور کا مقدمہ

سے وہ مرتد ہو گیا ہے۔ اس لئے اس شخص سے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ اس مقدمہ نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی اور مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس لئے نہیں کہ اس میں فریقین کی حیثیت بڑی ممتاز تھی ۔ وہ تو بالکل غیر معروف سے تھے۔ یہ اس لئے کہ (غیر منقسم) ہندوستان میں (غالباً) یہ اپنی نوعیت کا پہلا مقدمہ تھا جس میں فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ ایک شخص قادیانی مسلک اختیار کرنے کے بعد مسلمان رہتا ہے یا نہیں؟ اس اعتبار سے یہ متعلقہ فریقین کا مابہ النزاع معاملہ نہ رہا بلکہ قادیانیوں اور غیر قادیانیوں کے مابین ایک دینی سوال بن گیا جس کا عدالتی فیصلہ ظاہر ہے کہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ مقدمہ قریب نو سال تک زیر سماعت رہا اور آخر الامر محمد اکبر صاحب ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر نے (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) ۷ فروری ۱۹۳۵ء کو اس کا فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ اپنی شہرت اور اہمیت کے پیش نظر اس زمانے میں بھی الگ چھپ گیا تھا اور اس کے بعد بھی چھپتا رہا۔ میرے سامنے اس وقت اس کا وہ نسخہ ہے جسے جون ۱۹۷۳ء میں "محفل ارشاد یہ، سیالکوٹ" نے شائع کیا اور جو اب عام طور پر دستیاب ہو جاتا ہے۔

اس فیصلہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ مدعیہ کی طرف سے بڑے بڑے جید علمائے کرام بطور گواہ پیش ہوئے مثلاً مولانا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ عباسیہ بہاولپور۔ مولانا نجم الدین صاحب پروفیسر اورینٹل کالج لاہور، مولانا محمد حنیف صاحب مفتی دار العلوم دیوبند۔ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری اور مولانا سید انور شاہ صاحب شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند[1] وغیرہم۔ اس سے اس معاملہ کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ اس مسئلہ کا دار و مدار اس بات پر تھا کہ نبوت کی حقیقت کیا ہے اور نبی کسے کہتے ہیں؟ لیکن (انہوں نے کہا کہ) مشکل یہ ہے کہ

> موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان نبی کی حقیقت سے بھی ناآشنا ہیں۔ اس لئے بھی ان کے دلوں میں یہ مسئلہ گھر نہیں کر سکا کہ مرزا صاحب کو نبی ماننے میں کیا قباحت ہوتی ہے کہ جس پر اس قدر چیخ و پکار کی جا رہی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کی کچھ تھوڑی سی حقیقت بیان کر دی جائے۔ مدعیہ کی طرف سے نبی کی کوئی تعریف نہیں بیان کی گئی۔ صرف یہ کہا گیا ہے کہ نبوت ایک عہدہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے برگزیدہ بندوں کو عطا کیا جاتا ہے۔ اور نبی اور رسول میں فرق بیان کیا گیا ہے کہ ہر رسول نبی ہوتا ہے اور نبی کے لئے لازمی نہیں کہ وہ رسول بھی ہو۔ فریق ثانی نے بیان کیا ہے کہ رسول ایک انسان ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ احکام شریعت کی تبلیغ کے لئے بھیجتا ہے، برخلاف نبی کے کہ وہ عام ہے۔ کتاب لانے والے رسول کے لئے کتاب لانا شرط ہے۔ اسی طرح رسول کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ رسول وہ ہوتا ہے جو صاحب کتاب ہو یا سابقہ شریعت کے بعض احکام

---

[1] ان کا نام زبان پر آتے ہی، انکے علم و تقویٰ کے احساس سے نگاہیں ان کے احترام میں جھک جاتی ہیں۔

کو منسوخ کر دے۔ (فیصلہ صفحہ ۱۰۷ - ۱۰۶)

اس کے بعد فاضل جج نے لکھا۔

یہ تعریفیں چونکہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے کافی نہ تھیں، اس لئے میں اس جستجو میں رہا کہ نبی یا رسول کی کوئی ایسی جامع تعریف مل جائے جو تصریحاتِ قرآنی کی رو سے تمام لوازمِ نبوت پر حاوی ہو۔ (صفحہ ۱۰۷)

اس کے بعد انہوں نے لکھا کہ انہوں نے اس باب میں کافی جستجو کی لیکن نبی کی کوئی جامع تعریف انہیں نہ مل سکی۔

آخر کار ایک رسالہ میں ایک مضمون بعنوان "میکانکی اسلام" از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز میری نظر سے گزرا۔ اس میں انہوں نے مذہب اسلام کے متعلق آجکل کے روشن ضمیر طبقہ کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ اور پھر خود ہی اسکے حقائق بیان کئے ہیں۔ اس مسئلہ میں نبوت کی جو حقیقت انہوں نے بیان کی ہے میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جا سکتی۔ اور میرے خیال میں فریقین میں سے کسی کو اس سے انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں ان کے الفاظ میں ہی اس حقیقت کو بیان کرتا ہوں (صفحہ نمبر ۱۰۷)

ازاں بعد انہوں نے میرے اس مضمون سے خاصہ مفصل اقتباس درج کیا اور نبی کی جو تعریف میں نے پیش کی تھی اس پر مبنی بحث کے بعد اپنے فیصلہ میں کہا۔

مدعا علیہ قادیانی عقائد اختیار کرنے کی وجہ سے مرتد ہو چکا ہے۔ لہذا اس کے ساتھ مدعیہ کا نکاح تاریخ ارتدادِ مدعا علیہ سے فسخ ہو چکا ہے۔ (صفحہ ۱۸۲)

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اس مقدمہ میں ہندوستان کے بڑے بڑے جید علمائے کرام پیش ہوئے تھے جن میں سے ایک ایک کا بیان سینکڑوں صفحات پر مشتمل تھا۔ لیکن فاضل جج حقیقتِ نبوت کے متعلق ان میں سے کسی کے بیان سے بھی مطمئن نہ ہو سکے۔ وہ مطمئن ہوتے تو میرے ایک ایسے مضمون سے جو اس مقدمہ سے بالکل الگ آزادانہ لکھا گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ میرے مضمون کی وہ کونسی خصوصیت تھی جس کی بنا پر وہ اس قدر اطمینان بخش اور قولِ فیصل ثابت ہو گیا۔ وہ خصوصیت یہ تھی کہ میں نے مقامِ نبوت کی وضاحت قرآنِ کریم کی روشنی میں کی تھی اور خارج از قرآن بحثوں کو اس میں دخیل نہیں ہونے دیا تھا۔ یہی مسلک

## اقبالؒ اور قرآن

علامہ اقبالؒ کا بھی تھا۔ اور میرے دل میں ان کے احترام کی بنیاد بھی یہی ہے۔ انہوں نے اپنی سب سے پہلی تصنیف ـــــ اسرار و رموز کے آخر میں بحضورِ رحمۃ اللعالمین ایک عرضداشت پیش کی ہے جس میں وہ بصد سوز و گداز کہتے ہیں ؎

---

لہ یہ اُس شخص کے متعلق "عدالتی سند" ہے جس کے خلاف "منکرِ رسالت" ہونے کا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور ایسا کہنے والے نہ کوئی جھجک محسوس کرتے ہیں نہ ندامت۔ (طلوعِ اسلام)

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیر قرآں مضمر است

تو

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

اور انتہا یہ کہ

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اس کے برعکس

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام
با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
عرض کن پیشِ خدائے عزّوجل
عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

اور اس کے بعد بھی وہ تمام عمر مسلمانوں سے یہی کہتے رہے کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

# ختمِ نبوت کی ماہیت

ختمِ نبوت کی حقیقت و ماہیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ نبوت کہتے کسے ہیں۔ یہ موضوع بڑی فرصت چاہتا ہے جس کی اس وقت گنجائش نہیں۔ لیکن بایں ہمہ میں چند الفاظ میں اس کا ملخص پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ انسان عقل و فکر، مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ سے علم حاصل کرتا ہے۔ یہ ذرائع علم ہر شخص کے لئے کھلے ہوتے ہیں۔ اس لئے جو شخص بھی چاہے اپنی صلاحیت اور محنت کے مطابق اکتسابِ علم کر سکتا ہے۔ لیکن علم کا ایک اور ذریعہ بھی ہے جس میں انسان کی اپنی عقل و فکر اور سعی و کاوش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ وہ علم خدا کے ایک برگزیدہ بندے کو خدا کی طرف سے براہِ راست ملتا تھا۔ اس کی کیفیت یہی کہ جس منتخب ہستی کو یہ علم عطا ہوتا تھا اسے اس سے ایک دن پہلے تک بھی اس کا علم و احساس نہیں ہوتا تھا کہ اسے یہ علم عطا ہونے والا ہے۔ اس علم کو وحیِ خداوندی یا منزّل من اللہ کہا جاتا تھا۔ اور جس برگزیدہ ہستی کو یہ وحی عطا ہوتی تھی اسے نبی یا رسول کہہ کر پکارا جاتا۔ اس کی وحی کو خدا کی طرف سے عطا کردہ کتاب سے بھی تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ ہر نبی کو خدا کی طرف سے کتاب ملتی تھی۔ نبی اور رسول میں یہ فرق کہ رسول وہ ہوتا تھا جسے کتاب ملتی تھی اور نبی بلا کتاب آتا تھا، قرآنِ کریم کی تعلیم سے بے خبری کی دلیل ہے۔ قرآنِ کریم نے انبیاء اور رسل دونوں کے متعلق کہا ہے کہ انہیں کتاب دی جاتی تھی۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ...... (۲/۲۱۳)

یعنی اللہ تعالیٰ نے حضراتِ انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا اور ان سب کو کتاب دی۔ دوسری جگہ سورۂ حدید

میں ہے کہ:۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ... (۵۷/۲۵)

یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام رسولوں کو کتاب ملی۔ ان آیات (اور انہی جیسی متعدد دیگر آیات) سے واضح ہے کہ ہر نبی اور ہر رسول کو خدا کی طرف سے کتاب ملتی تھی۔ اور "احمدیوں" کا یہ کہنا کہ نبی بلا کتاب آتا تھا قرآن کریم کی نصوصِ صریحہ کے خلاف ہے۔ واضح رہے کہ نبی اور رسول بھی الگ الگ نہیں ہوتے تھے۔ یہ ایک ہی ہستی کی دو خصوصیات تھیں۔ یوں کہئے کہ خدا کی طرف سے وحی پانے کی حیثیت سے اسے نبی کہا جاتا تھا اور اس وحی کو دوسروں تک پہنچانے کی حیثیت سے رسول۔ نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو گوشے تھے۔

خدا کی طرف سے وحی یا کتاب نازل ہونے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ تا آنکہ مشیت کے پروگرام کے مطابق وہ زمانہ آگیا جب یہ سمجھا گیا کہ انسانی راہ نمائی کے لئے جو کچھ خدا کی طرف سے دیا جانا مقصود و مطلوب ہے اسے نہایت واضح اور مکمل حیثیت سے آخری مرتبہ دیدیا جائے۔ چنانچہ یہ آخری وحی حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئی اور اسے قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دیا گیا۔ اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ (۶/۱۱۶)

خدا نے جو کچھ انسانوں سے کہنا تھا، جو کلام انہ سے کرنا تھا، جو باتیں ان سے کرنی تھیں اس کتاب میں انہیں مکمل طور پر دے دیا گیا ہے۔ ان میں اب کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اس کے ساتھ ہی یہ ضمانت بھی دیدی کہ

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹)

ہم نے اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم اس کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔ اور اس کے بعد وحی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ وحی تو خدا کی طرف انسانوں کے لئے راہ نمائی کی خاطر آتی تھی جب وہ راہنمائی مکمل اور غیر متبدل طور پر دے دی گئی اور قیامت تک اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا تو پھر وحی کی ضرورت کیا باقی رہی؟ اور جب وحی کی ضرورت ہی نہ رہی تو پھر کسی نبی یا رسول کے آنے کا مقصد کیا! اسی حقیقت کو ختم نبوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسلام میں یہ نظریہ اس قدر صاف، واضح اور مسلّم تھا کہ مسلمانوں کو اس باب میں نہ کبھی کوئی شک گذرا نہ الجھن پیدا ہوئی۔ امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنے سچا ہونے کی نشانیاں دکھلانے کے لئے مہلت چاہی۔ امام صاحب نے سنا تو فرمایا کہ جس شخص نے اس مدعی نبوت سے کوئی علامت بھی طلب کی وہ بھی کافر ہو جائے گا کیونکہ اس سے مترشح ہوگا کہ اسے نبی اکرمؐ کے آخری نبی ہونے کی بابت تردد ہے۔ اس سے آپ اندازہ فرما لیجئے کہ ختمِ نبوت کا عقیدہ مسلمانوں میں کس قدر مسلّم اور ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر تھا۔ ختمِ نبوت کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اب انسان اس راہ نمائی کی روشنی میں جسے غیر متبدل قرآنی ہیں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اپنے معاملات کا حل آپ دریافت کرے۔ واضح رہے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان کو اب وحی کی راہ نمائی کی ضرورت نہیں رہی اور اب وہ تنہا اپنی عقل و فکر کی رو سے اپنے معاملات حل کر سکتا ہے۔ ایسا سمجھنا قطعاً غلط ہے۔ انسانی عقل اسی طرح وحی کی محتاج ہے جس طرح انسانی آنکھ سورج کی روشنی کی محتاج۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو متعدد

مقامات پر دبالخصوص اپنے خطبات میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے اسکی بھی وضاحت کی ہے کہ وحی کی روشنی میں انسانی معاملات کا حل انفرادی طور پر نہیں کیا جائے گا بلکہ یہ ایک اجتماعی نظام کی رو سے ہوگا جسے خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جاتا ہے۔ مزید سمجھنے کے لئے اسے دستوری نظام مملکت کہہ لیجئے۔ یعنی مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت جس میں تمام کاروبار دستورِ آن کریم کے عطا کردہ اصول و اقدار و قوانین کے تابع رہ کر سرانجام دیا جائے۔ اسی کو نظریہ پاکستان کہتے ہیں جسے علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا۔

(۰)

## یہ سیاسی تحریک تھی

مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کیا تو اسے ایک مذہبی مسئلہ کی حیثیت سے پیش کیا تاکہ مسلمان اسی الجھاؤ میں رہیں اور اس مقصد اور غایت کی طرف ان کی نگاہ ہی نہ اٹھنے پائے جس کے لئے یہ سارا ڈرامہ اسٹیج کیا گیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو بے نقاب کیا کہ تحریک "احمدیت" مذہبی تحریک ہے ہی نہیں۔ یہ ایک خالصتہً سیاسی تحریک ہے جسے انگریزوں کے حکومتی مصالح نے پیدا کیا ہے اور جسے عوام کو دھوکہ دینے کے لئے مذہبی نقاب اوڑھا دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ انگریزوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کی تو اس کے خلاف انہیں سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں کی طرف سے تھا سیاسی طور پر تو اس لئے کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے سلطنت چھینی تھی اور مذہبی سطح پر اس لئے کہ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھا کہ مسلمان غیر مسلموں کی حکومت کے تابع زندگی بسر کرنا خلافِ اسلام سمجھتے تھے۔ اور ایسی حکومت کے خلاف جہاد کرنا اپنا دینی فریضہ۔ آپ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب (THE INDIAN MUSALMANS) اٹھا کر دیکھئے۔ اس نے اس حقیقت کو بڑے واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اسی دینی جذبہ کے ماتحت حضرت سید احمد بریلوی رح اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے تحریک جہاد شروع کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی تہ میں بھی اسے یہی جذبہ کارفرما نظر آتے ہیں۔ اور اس کے بعد وہابی تحریک کو بھی وہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی بیان کرتا ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان کے دین فروش علماء سے اس قسم کے فتاویٰ بھی حاصل کر لئے جن میں کہا گیا کہ انگریزوں کی اطاعت فرض ہے اور ان کے خلاف جہاد حرام لیکن مسلمانوں پر ان فتاویٰ کا چنداں اثر نہ ہوا۔ ہمارے علماء کے فتاویٰ عام طور پر اپنی اثر انگیزی کھو چکے تھے۔ اس سلسلہ میں برطانوی سیاستدان اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمان صرف دین سے متاثر ہو سکتا ہے اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں یہ بتایا جائے کہ ان پر خود خدا نے حکومت برطانیہ کی اطاعت فرض قرار دی ہے اور اس نے جہاد کو منسوخ اور حرام قرار دیا ہے۔ یہ تھا وہ پس منظر جسے علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۵ء میں یہ کہہ کر اٹھایا کہ

> مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں "احمدیت" کا موقف ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے

(احمدیت اور اسلام بحوالہ ختم نبوت اور تحریک احمدیت، پہلا ایڈیشن صفحہ ۱۹۴)

اس کی تشریح میں انہوں نے کہا کہ

مسلمان عوام کو جن میں مذہبی جذبہ بہت شدید ہے۔ صرف ایک چیز قطعی طور پر متاثر کر سکتی ہے یعنی وحی کی سند۔ لہٰذا راسخ عقاید کو مؤثر طریق پر جڑ بنیاد سے اکھیڑنے اور مذکورہ بالا سوالات پر جو دینی نظریات مضمر ہیں ان کی ایک ایسی نئی تفسیر و تعبیر کرنے کے لئے جو سیاسی طور پر مفید مطلب ہو، یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس کی بنیاد وحی پر رکھی جائے۔ یہ بنیاد "احمدیت" نے فراہم کر دی۔ خود "احمدیوں" کا دعویٰ ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے جو انہوں نے سرانجام دی ہے۔ (احمدیت اور اسلام۔ انگریزی ایڈیشن صفحہ ۱۲۶)

میں نے اس اجمال کی تفصیل اپنی کتاب "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" میں مرزا غلام احمد صاحب کی تحریروں کی روشنی میں پیش کی ہے۔ انہی میں سے چند ایک میں اس وقت آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

## مرزا صاحب کی خاندانی خدمات

انگریزوں کو اس مقصد کے لئے جس قسم کی شخصیت کی ضرورت تھی اس کے لئے اپنے آپ کو بطور "امیدوار" پیش کرتے ہوئے مرزا غلام احمد نے عرضداشت پیش کی کہ۔

میں ایک ایسے خاندان سے ہوں جو اس گورنمنٹ کا پکا خیرخواہ ہے۔ میرا والد مرزا غلام مرتضیٰ گورنمنٹ کی نظر میں ایک وفادار اور خیرخواہ آدمی تھا جن کو دربار گورنری میں کرسی ملتی تھی اور جن کا ذکر مسٹر گریفن صاحب کی تاریخ رئیسان پنجاب میں ہے۔ اور ۱۸۵۷ء میں انہوں نے اپنی طاقت سے بڑھ کر سرکار انگریزی کو مدد دی تھی۔ یعنی پچاس سوار اور گھوڑے بہم پہنچا کر عین زمانہ غدر کے وقت سرکار انگریزی کی امداد میں دیئے تھے۔

(کتاب البریہ۔ صفحہ نمبر ۳)

اس کے بعد انہوں نے کہا۔

پھر میرے والد کی وفات کے بعد میرا بڑا بھائی مرزا غلام قادر خدمات سرکاری میں مصروف رہا اور جب تموں کی رگذر پر مفسدوں کا سرکار انگریزی کی فوج سے مقابلہ ہوا تو وہ سرکار انگریزی کی طرف سے لڑائی میں شریک ہوئے۔ (ایضاً صفحہ ۵)

ان خدمات جلیلہ کی روشنی میں، مرزا صاحب اس منصب کے لئے منتخب کر لئے گئے اور انہوں نے مامور من اللہ ہونے کے دعاوی شروع کر دیئے۔ انہوں نے پہلی ہی جست میں اپنے نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ ایک سوچے سمجھے پروگرام کے مطابق بتدریج اس مقام پر پہنچے ۔۔۔ ملہم ربانی، صاحب کشف والہام، محدث۔ مجدد۔ مسیح موعود ظلی، بروزی حلولی نبوت، اور پھر آخر الامر مکمل نبوت اور رسالت ۔۔۔ ایسا تدریجی پروگرام کیوں اختیار کیا گیا، اس کی مصلحت خود انہی کی زبان سے سنیئے۔ مرزا صاحب شروع میں عام مسلمانوں کی طرح یہی کہتے چلے

آگے چلئے قرآن مجید میں حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے متعلق جو آیات آئی ہیں ان میں حضرت عیسےٰ سے مراد وہی پیغمبر ہیں جو رسول اللہ سے پہلے ہو گزرے ہیں لیکن بعد میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ میں مسیح موعود ہوں اور ان آیات میں میرے ہی متعلق ذکر کیا گیا ہے۔ شروع کے بیانات اور اس دعوے میں اختلاف کیوں ہوا، اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

## پیچ میں پھنسانے کیلئے

یہ الہامات اگر میری طرف سے اس موقعہ پر ظاہر ہوتے جبکہ علماء مخالف ہو گئے تھے، تو وہ ہزارہا اعتراض کرتے۔ لیکن وہ ایسے موقعہ پر شائع کئے گئے جبکہ یہ علماء میرے موافق تھے۔ یہی سبب ہے کہ باوجود اس قدر جوشوں کے، ان الہامات پر انہوں نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ وہ ایک دفعہ ان کو قبول کر چکے تھے۔ اور سوچنے سے ظاہر ہوگا کہ میرے دعویٰ مسیح موعود ہونے کی بنیاد انہی الہامات سے پڑی ہے اور انہی میں خدا نے میرا نام عیسےٰ رکھا اور جو مسیح موعود کے حق میں آیتیں تھیں وہ میرے حق میں بیان کر دیں۔ اگر علماء کو خبر ہوتی کہ ان الہامات سے تو اس شخص کا مسیح ہونا ثابت ہوتا ہے تو وہ کبھی ان کو قبول نہ کرتے۔ یہ خدا کی قدرت ہے کہ انہوں نے قبول کر لیا اور اس پیچ میں پھنس گئے۔

(اربعین نمبر ۲۔ صفحہ ۲۱)

## انگریزوں کی اطاعت

آپ نے غور فرمایا کہ بتدریج دعویٰ کرنے میں کیا مصلحت پنہاں تھی! یہ تو بہرحال ان کے دعاوی کی سیڑھیاں تھیں لیکن ہر دعوے کی علم اور غایت ایک ہی تھی یعنی یہ کہ انگریزوں کی اطاعت فرض ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (۴/۵۹)۔ مرزا صاحب نے اس آیت کے لکھنے کے بعد تحریر کیا کہ

اولی الامر سے مراد جسمانی طور پر بادشاہ اور روحانی طور پر امام الزمان ہے اور جسمانی طور پر جو شخص ہمارے مقاصد کا مخالف نہ ہو اور اس سے مذہبی فائدہ ہمیں حاصل ہو سکے وہ ہم میں سے ہے۔ اس لئے میری نصیحت اپنی جماعت کو یہی ہے کہ وہ انگریزوں کی بادشاہت کو اپنے اولی الامر میں داخل کریں اور دل کی سچائی سے ان کے مطیع رہیں۔

(ضرورت الامام۔ صفحہ ۲۳)

علامہ اقبالؒ ضربِ کلیم میں نفسیاتِ غلامی کے عنوان سے کہتے ہیں کہ

سخت باریک ہیں امراضِ اُمم کے اسباب　　کھول کر کہیئے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی
دینِ شبیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ　　دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی
ہو اگر قوتِ فرعون کی در پردہ مرید　　قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی

## جہاد حرام ہے

اس طرح مرزا صاحب آہستہ آہستہ اس مقام پر پہنچ گئے جس کے لئے یہ سارا ڈرامہ کھیلا گیا تھا یعنی انہوں نے اعلان کر دیا کہ جہاد حرام ہے۔ انہوں نے کہا۔

آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو شخص کافر پر تلوار اٹھاتا اور اپنا نام غازی رکھتا ہے وہ اس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے فرما دیا ہے کہ مسیح موعود کے آنے پر تمام تلوار کے جہاد ختم ہو جائینگے۔ سو اب میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں۔ (اربعین نمبر ۴ - صفحہ ۷۴)

اپنے اسی "الہام" کو نظم میں یوں بیان فرمایا کہ

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال — دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آگیا مسیح جو دیں کا امام ہے — دیں کی تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
اب آسماں سے نورِ خدا کا نزول ہے — اب جنگ اور جہاد کا فتوےٰ فضول ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد
منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

(مندرجہ تبلیغِ رسالت جلد نہم صفحہ ۴۹)

## گورنمنٹ کی خدمت میں درخواستیں

[illegible] کے بعد ان کی "نبوت" کا فریضہ یہ قرار پا گیا کہ وہ اس خیال کو عام کرتے رہیں کہ جہاد حرام ہے جہاد حرام ہے۔ وہ یہ کرتے تھے اور ساتھ کے ساتھ اس کی اطلاع حضور گورنمنٹ برطانیہ کو دیتے رہتے تھے۔ مثلاً انہوں نے ۱۰ دسمبر ۱۸۹۴ء کو ایک اشتہار شائع کیا جس کا عنوان تھا "اشتہار لائق توجہ گورنمنٹ جو جناب ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند اور جناب گورنر جنرل ہند اور لفٹیننٹ گورنر پنجاب اور دیگر معزز حکام کے ملاحظہ کے لئے شائع کیا گیا"۔ اس میں انہوں نے لکھا۔

میں نے برابر سولہ برس سے یہ اپنے پر حق واجب ٹھہرا لیا ہے کہ اپنی قوم کو اس گورنمنٹ کی خیر خواہی کی طرف بلاؤں اور ان کو سچی اطاعت کی طرف ترغیب دوں۔ چنانچہ میں نے اس مقصد کے سرانجام کے لئے اپنی ہر ایک تالیف میں یہ لکھنا شروع کیا کہ اس گورنمنٹ کے ساتھ کسی طرح مسلمانوں کو جہاد درست نہیں ہے۔

دوسری جگہ لکھا ہے

میں نے خدا تعالیٰ سے یہ عہد کیا ہے کہ کوئی مبسوط کتاب بغیر اس کے تالیف نہیں کروں گا جو اس میں احسانات قیصرۂ ہند کا ذکر نہ ہو۔

(نور الحق حصہ اول صفحہ ۲۸)

وہ اپنی کتاب تریاق القلوب میں لکھتے ہیں۔

میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنتِ انگریزی کی تائید اور حمایت میں گزرا ہے اور میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہارات شائع کئے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔

(صفحہ ۱۵)

چنانچہ وہ فخریہ بیان کرتے ہیں کہ میری ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ:

لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلیظ خیالات چھوڑ دیئے جو نافہم ملاؤں کی تعلیم سے ان کے دلوں میں تھے۔ یہ ایک ایسی خدمت ظہور میں آئی کہ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اس کی نظیر کوئی مسلمان دکھلا نہ سکا۔

(ستارۂ قیصرہ صفحہ ۳)

یہ تھا اس نبوتِ جدیدہ کا ماحصل۔ اقبالؒ کس درد و سوز سے کہتے ہیں کہ:

ہو بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام — ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز
اس کے نفسِ گرم کی تاثیر ہے ایسی — ہو جاتی ہے خاکِ چمنستان شرر آمیز
شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار — کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغانِ سحر خیز
اُس مردِ خود آگاہ و خدا مست کی صحبت — دیتی ہے گدائی کو شکوہِ جم و پرویز

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

(ضربِ کلیم صفحہ ۵۱)

## فریاد! مجھے مولوی ستاتے ہیں!

وحیِ خداوندی کی تاثیر سے تو فی الواقعہ خاکِ چمنستان شرر آمیز اور بلبلِ ناتواں میں شاہین کی ادا نمودار ہو جاتی ہے لیکن ہمارے دور کے مدعیٔ نبوت کی کیفیت یہ ہے کہ وہ "حضورِ گورنمنٹ عالیہ کی خدمت میں عاجزانہ درخواست" پیش کرتے ہیں جس میں کہتے ہیں کہ:

میں اس گورنمنٹ محسنہ کے زیرِ سایہ ہر طرح سے خوش ہوں۔ صرف ایک رنج اور درد اور غم مجھے لاحق ہے جس کا استغاثہ پیش کرنے کے لئے اپنی محسن گورنمنٹ کی خدمت میں حاضر ہوں اور وہ یہ کہ اس ملک کے مولوی مسلمان اور ان کی جماعتوں کے لوگ حد سے زیادہ مجھے ستاتے اور دکھ دیتے ہیں۔ (مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ہشتم صفحہ ۵۳)

## انگریزوں کا خود کاشتہ پودا!

اس کے بعد وہ سرکار عالیہ سے کہتے ہیں کہ ہم جواب کو مدد کے لئے پکارتے ہیں تو کچھ اپنی حفاظت کے لئے نہیں بلکہ یہ اس پودے کی حفاظت سمجھ لیتے ہیں جو خود آپ کے اپنے ہاتھوں کا لگایا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ لیفٹیننٹ گورنر بہادر کے نام اپنی درخواست مؤرخہ ۲۴ر فروری ۱۸۹۸ء میں لکھتے ہیں۔

> میری اس درخواست سے جو حضور کی خدمت میں معہ اسماء مریدین روانہ کرتا ہوں، مدعا یہ ہے کہ اگرچہ میں ان خدمات خاصہ کے لحاظ سے جو میں نے اور میرے بزرگوں نے محض صدق دل اور اخلاص اور جوش اور وفاداری سے سرکار انگریزی کی خوشنودی کے لئے کی ہیں، عنایت خاص کا مستحق ہوں۔ صرف یہ التماس ہے کہ سرکار دولت مدار ...... اس خود کاشتہ پودے کی نسبت نہایت حزم واحتیاط اور تحقیق و توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو ارشاد فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو ایک خاص عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔ ..... اسلئے کہ یہ ایک ایسی جماعت ہے جو سرکار انگریزی کی نمک پروردہ اور نیک نامی حاصل کردہ، مورد مراحم گورنمنٹ ہے۔

وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

> ہم نے جو اس گورنمنٹ کے زیر سایہ آرام پایا اور پا رہے ہیں وہ آرام ہم کسی اسلامی گورنمنٹ میں بھی نہیں پا سکتے۔ ہرگز نہیں پا سکتے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۵۰۹)

وہ اپنے اشتہار مورخہ ۲۲ر مارچ ۱۸۹۷ء میں لکھتے ہیں۔

> میں اپنے کام کو نہ مکہ میں اچھی طرح چلا سکتا ہوں نہ مدینہ میں۔ نہ روم میں نہ شام میں۔ نہ ایران میں نہ کابل میں۔ مگر اس گورنمنٹ میں جس کے اقبال کے لئے میں دعا کرتا ہوں۔
>
> (مندرجہ تبلیغ رسالت۔ جلد ششم ص ۶۹)

وقت کی کمی کی بنا پر میں ابھی اتنا سا ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ جو احباب مزید تفصیل دیکھنا چاہیں وہ میری کتاب "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" کا مطالعہ فرمالیں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں میں نے یہ بھی تفصیل سے بتایا ہے کہ مرزا صاحب نے کس طرح نبوت کا دعویٰ کیا۔ مسلمانوں کو کافر اور خارج از اسلام قرار دیا اور اپنے متبعین پر مشتمل ایک نئی امت کی تشکیل کی۔ یہ نکتہ زیادہ اہم ہے اور اب میں اسی کے متعلق کچھ تفصیل سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔

## امت رسول کی نسبت سے متشکل ہوتی ہے

دنیا میں خدا کے ماننے والے عام ہوتے ہیں اور ان میں کسی قسم کی تخصیص و تمیز نہیں ہوتی۔ لیکن ایک جداگانہ

امت کی تشکیل اس رسول پر ایمان لانے سے ہوتی ہے جسے اس کے پیرو سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی سمجھیں۔ مثلاً ایک یہودی حضرت عیسےٰ علیہ السلام سے پیشتر کے تمام انبیائے بنی اسرائیل پر ایمان لاتا ہے لیکن بایں ہمہ وہ امتِ عیسوی کا فرد قرار نہیں پاتا۔ جس دن وہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آتا ہے وہ قومِ یہود کا فرد نہیں رہتا، عیسائی امت کا فرد بن جاتا ہے۔ اسی طرح ایک عیسائی، رسول اللہ صلعم سے پہلے کے تمام انبیاء پر ایمان رکھتا ہے لیکن وہ امتِ محمدیہ کا فرد نہیں بنتا۔ جس دن وہ نبوتِ محمدیہ پر ایمان لے آتا ہے وہ عیسائی امت کا فرد نہیں رہتا۔ امتِ محمدیہ کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ اس اصول کے مطابق اگر کوئی شخص رسول اللہ کے بعد کسی نبوت پر ایمان لے آتا ہے تو وہ امتِ محمدیہ کا فرد نہیں رہتا اس نئے نبی کی امت کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو "رموزِ بیخودی" میں بڑے دلآویز انداز میں بیان کیا ہے۔ جب کہا ہے۔

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید! وز رسالت در تنِ ما جاں دمید
حرفِ بے صوت اندریں عالم بدیم از رسالت مصرعِ موزوں شدیم
ما ز حکمِ نسبتِ اوؐ ملتیم اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم
فرد از حق ملت از وے زندہ است از شعاعِ مہرِ او تابندہ است
از رسالت ہمنوا گشتیم ما ہم نفس، ہم مدعا گشتیم ما

مسلمان جو ایک جداگانہ امت کے فرد قرار پاتے ہیں تو خدا پر ایمان کی بنا پر نہیں بلکہ محمد رسول اللہ کی رسالت پر ایمان لانے کی بنا پر ایسا قرار پاتے ہیں۔ یہ امتِ محمدیہ کے فرد اسی صورت میں قرار پا سکتے ہیں کہ یہ حضورؐ کو سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی سمجھیں۔ ختمِ نبوت کے معنی یہی نہیں کہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی پر نبوت ختم ہو گئی بلکہ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اب دنیا میں دین کی بنیادوں پر کوئی نئی امت وجود میں نہیں آ سکتی۔ حضرت علامہؒ اس باب میں فرماتے ہیں:-

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد بر رسولِؐ ما رسالت ختم کرد

اور اس ساری بحث کا نکتۂ آخریں یہ ہے

رونق از ما محفلِ ایام را اوؐ رسل را ختم و ما اقوام را

ساری بحث چار لفظوں میں ختم ——— اوؐ رسل را ختم و ما اقوام را ——— اسی حقیقت کو وہ بانگِ درا میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

وہ "احمدیت اور اسلام" میں تحریر فرماتے ہیں۔

ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیتِ دین خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا رہینِ منت ہے۔

خود مرزا غلام احمد بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب "آئینہ کمالاتِ اسلام" میں لکھتے ہیں

جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے گا۔ اس دعویٰ میں ضرور ہے کہ وہ خدا تعالےٰ کی ہستی کا اقرار کرے اور نیز یہ بھی کہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے میرے پر وحی نازل ہوتی ہے۔ اور نیز خلق اللہ کو

وہ کلام سناتا ہے جو اس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا ہے اور ایک امت بنا دے جو اس کو نبی سمجھتی ہو اور اس کی کتاب کو کتاب اللہ جانتی ہو (صفحہ ۱۴۴)

اسی بنا پر مرزا صاحب نے اپنے متبعین کو مسلمانوں سے الگ قرار دیا اور ان کی ایک نئی امت تشکیل کی اور ۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں خود درخواست دے کر ان کا ایک الگ جماعت کی حیثیت سے شمار کرایا۔ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ مرزا صاحب نے اپنی الگ امت کیوں بنائی، اخبار الفضل نے لکھا۔

کیا مسیح ناصری نے اپنے پیروؤں کو یہود سے الگ نہیں کیا؟ کیا وہ انبیاء جن کے سوانح کا علم ہم تک پہنچا ہے اور ہمیں ان کے ساتھ جماعتیں بھی نظر آتی ہیں، انہوں نے اپنی جماعتوں کو غیروں سے الگ نہیں کر دیا؟ ہر ایک شخص کو ماننا پڑے گا کہ بے شک کیا ہے بس اگر حضرت مرزا صاحب نے بھی جو کہ نبی اور رسول ہیں اپنی جماعت کو منہاج نبوت کے مطابق غیروں سے الگ کر دیا تو نئی اور انوکھی بات کون سی کی!

(الفضل بابت ۲۶ فروری ــ ۲ مارچ ۱۹۱۸ء)

انہوں نے اپنی امت کو امت محمدیہ سے الگ بھی ایسے واضح اور نکھرے الفاظ سے کیا کہ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ رہ جائے۔ انہوں نے کہا کہ

خدا تعالیٰ نے میرے پر ظاہر کیا ہے کہ ہر ایک وہ شخص جس تک میری دعوت پہنچی ہے اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا ہے وہ مسلمان نہیں۔

(ارشاد مرزا صاحب منقول از اخبار الفضل بابت ۱۵ جنوری ۱۹۳۵ء)

میاں محمود صاحب اس سے بھی آگے بڑھے اور فرمایا کہ

کل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا۔ وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ (آئینۂ صداقت ص ۳۵)

مرزا صاحب کے دوسرے صاحبزادہ، بشیر احمد کہتے ہیں۔

ہر ایک شخص جو موسیٰ کو تو مانتا ہے مگر عیسیٰ کو نہیں مانتا یا عیسیٰ کو مانتا ہے مگر محمد کو نہیں مانتا۔ یا محمد کو مانتا ہے مگر مسیح موعود کو نہیں مانتا۔ وہ نہ صرف کافر بلکہ پکا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ (کلمۃ الفصل مصنفہ صاحبزادہ بشیر احمد)

جب مسلمان، دائرہ اسلام سے خارج قرار پا گئے تو دین کی بنیادوں پر ان سے ہر قسم کے تعلقات بھی ناجائز ہو گئے۔ ان کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز۔ ان کا جنازہ پڑھنا بھی ناجائز ــ مرزا صاحب نے خود اپنے بیٹے (فضل احمد) کا جنازہ بھی اس لئے نہ پڑھا کہ وہ "غیر احمدی" تھا۔ اور چوہدری ظفر اللہ خان صاحب، قائداعظم کے جنازہ کی نماز میں بھی اسی لئے شریک نہ ہوئے، غیر مسلموں کے ساتھ ایک طرف الگ کھڑے رہے۔ جہاں تک مسلمانوں کے ساتھ رشتوں ناطوں کا تعلق ہے، انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کی لڑکیاں لی تو جا سکتی ہیں انہیں لڑکیاں دی نہیں جا سکتیں۔ مرزا محمود صاحب نے کہا تھا کہ اس باب میں ان کی پوزیشن، ہندوؤں اور سکھوں

جیسی ہے کہ ان کی لڑکیاں بھی لی جا سکتی ہیں۔ انہیں لڑکیاں دی نہیں جا سکتیں۔ (الفضل ۲۷ رجولائی ۱۹۲۲ء)
انہی فیصلوں کی رُو سے، صاحبزادہ بشیر احمد نے لکھا کہ

> غیر احمدیوں سے ہماری نمازیں الگ ہو گئیں۔ ان کو لڑکیاں دینا حرام قرار دیا گیا۔ ان کے جنازے پڑھنے سے روکا گیا۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے جو ہم ان کے ساتھ مل کر کر سکتے ہیں۔ دو قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔ ایک دینی دوسرے دنیوی۔ دینی تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ عبادت کا اکٹھا ہونا ہے اور دنیوی تعلق کا بھاری ذریعہ رشتہ و ناطہ ہے۔ سو یہ دونوں ہمارے لئے حرام قرار دے دیئے گئے ہیں۔ (کلمۃ الفضل)

## الگ قوم قرار دیجئے

علامہ اقبالؒ نے ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ۱۹۳۵ء میں یہ تحریک اٹھائی اور تجویز یہ کیا کہ:-

> میری رائے میں حکومت کے لئے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی ہی رواداری سے کام لے گا جیسے وہ باقی اہلِ مذاہب کے معاملے میں اختیار کرتا ہے۔
>
> (احمدیت اور اسلام)

میں نے جو اقتباسات آپ حضرات کے سامنے پیش کئے ہیں ان سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ مرزا غلام احمد کے متبعین روزِ اول سے اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ امت تصور کرتے تھے۔ وہ اس تصور کی عام نشر و اشاعت بھی کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے آپ کو کہتے مسلمان ہی تھے۔ وہ ایسا کیوں کرتے تھے۔ اس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:-

> اس امر کے سمجھنے کے لئے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں رہنے کے لئے کیوں مضطرب ہیں۔ علاوہ سرکاری ملازمتوں کے مفاد کے ان کی موجودہ آبادی جو چھپن ہزار ہے، انہیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں دلا سکتی اور اس لئے انہیں سیاسی اقلیت کی حیثیت بھی نہیں مل سکتی۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ قادیانیوں نے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کا مطالبہ نہیں کیا۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مجالس قانون ساز میں ان کی نمائندگی نہیں ہو سکتی۔ (احمدیت اور اسلام)

ان لوگوں کی اسی دو رخی پالیسی کے پیشِ نظر انہوں نے (علامہ اقبالؒ نے) کہا تھا کہ بہائیت، قادیانیت سے زیادہ دیانت دار ہے کہ انہوں نے اگر دعوائے نبوت کیا ہے تو اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ امت قرار دیا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے حکومت سے کہا تھا کہ وہ اس معاملہ کو یکسو کر دے اور جس بات کو یہ لوگ اپنے عقیدے کے طور پر اختیار کئے ہوئے ہیں (یعنی مسلمانوں سے ایک الگ امت) اسے قانونی حیثیت دے دیں۔

انگریزی حکومت نے اس تجویز کو قابلِ قبول نہ سمجھا کیونکہ یہ خود ان کے مصالح اور مقاصد کے بھی خلاف جاتی تھی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی مسلمانوں نے اس مطالبہ کو متعین طور پر پیش نہ کیا، یا یوں کہیئے کہ یہ آواز شور و غوغا میں گم ہو جاتی رہی۔ البتہ طلوعِ اسلام اسے متعین طور پر دہراتا رہا تا آنکہ ستمبر ۱۹۷۴ء میں اس نے قانونی شکل اختیار کر لی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا سہرا بالواسطہ حضرت علامہؒ ہی کے سر بندھتا ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

(۱)

## "لاہوری احمدی"

لاہوری "احمدی" یہ کہہ کر لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم مرزا صاحب کو نبی نہیں مانتے۔ مسیح موعود مانتے ہیں اور یہ ایسا دعویٰ نہیں جس کے نہ ماننے سے کوئی مسلمان کافر قرار پا جائے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کو کافر نہیں کہتے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ قادیانیوں کے ساتھ ہمیں بھی کیوں دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جاتا ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ حقیقت کیا ہے۔

مرزا صاحب نے مسیح موعود ہونے کا بھی دعویٰ کیا تھا ــــ اور انہوں نے کون سا دعویٰ نہیں کیا تھا؟ ملہم، مامور من اللہ۔ محدث۔ مجدد۔ مہدی۔ ظلّی، بروزی۔ طفیلی۔ حقیقی نبی۔ محمدؐ کا اوتار۔ خود محمدؐ۔ کرشن گوپال وغیرہ۔ انہوں نے ان کے دعوے مسیح موعود کے منکرین کے متعلق کہا۔

> کفر دو قسم پر ہے۔ ایک کفر یہ ہے کہ ایک شخص اسلام سے ہی انکار کرتا ہے اور آنحضرتؐ کو رسولِ خدا نہیں مانتا۔ دوسرے یہ کفر کہ مثلاً وہ مسیح موعود کو نہیں مانتا اور اس کو باوجود اتمامِ حجت کے جھوٹا جانتا ہے جس کے ماننے اور سچا جاننے کے بارے میں خدا اور رسول نے تاکید کی ہے اور پہلے نبیوں کی کتابوں میں بھی تاکید پائی جاتی ہے پس اس لئے کہ وہ خدا اور رسول کے فرمان کا منکر ہے، کافر ہے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہیں۔
>
> (حقیقۃ الوحی ۔ ص ۱۷۹)

آپ دیکھیں گے کہ لاہوری "احمدی" حضرات مرزا صاحب کی اس عبارت کو کبھی پیش نہیں کریں گے۔ یہ تو رہا مرزا صاحب کو مسیح موعود نہ ماننے والوں کے متعلق کہ وہ کافر ہیں۔ اب مرزا صاحب کا خود اپنے متعلق فتویٰ بھی سن لیجئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے جہاد بالسیف کو منسوخ قرار دیا اور اسے حرام بتایا۔ جہاد بالسیف قرآن کریم کا جس قدر اہم حکم ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کے کسی حکم کو منسوخ قرار دینے والے کے متعلق مرزا صاحب کا فیصلہ ملاحظہ فرمائیے۔ وہ اپنی کتاب ازالۂ اوہام میں لکھتے ہیں۔

> ہم پختہ یقین کے ساتھ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن شریف خاتم کتبِ سماوی ہے۔ اور ایک شعشہ یا نقطہ اس کی شرائع اور حدود اور احکام اور اوامر سے زیادہ نہیں ہو سکتا نہ کم ہو سکتا ہے اور اب کوئی ایسی وحی یا الہام منجانب اللہ نہیں ہو سکتا جو احکامِ فرقانی کی ترمیم

تنسیخ یا کسی ایک حکم کی تبدیلی و تغییر کر سکتا ہو۔ اور اگر کوئی ایسا خیال کرے تو وہ ہمارے نزدیک ا
جماعت مومنین سے خارج اور ملحد اور کافر ہے۔ (ص ۱۰۔ بحوالہ پیغام صلح مورخہ ۵ دسمبر ۱۹۳۵ء)

اب آپ سوچئے کہ مسلمانوں نے اگر مرزا صاحب کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا ہے تو یہ خود مرزا صاحب کے فیصلے کے مطابق ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ بحث ہی بیکار ہے کہ لاہوری جماعت مرزا صاحب کو کیا مانتی ہے اور قادیانی (ربوی) جماعت کیا؟ لاہوری جماعت کا یہی کہنا ہے نا، کہ مرزا صاحب کو نبی تو ربوہ والے مانتے ہیں۔ ہم انہیں ایسا نہیں مانتے۔ اس لئے ربوہ والوں کے ساتھ ہمیں بھی دائرہ اسلام سے خارج کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک جو لوگ مرزا صاحب کو نبی مانتے ہیں انہیں دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جانا درست ہے۔ لیکن ٹھہرئیے۔ یہ بھی فریب دہی کی ایک ادا شکل ہے۔ لاہوری "احمدی" قادیانیوں (ربوہ) کو بھی دائرہ اسلام سے خارج قرار دیئے جانے کے لئے تیار نہیں۔ جس زمانے میں یہ سوال زیر غور تھا کہ "احمدیوں" کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے تو لاہوری جماعت نے اپنے اخبار "پیغام صلح" کی اشاعت بابت ۳۱ مئی ۱۹۷۴ء میں لکھا تھا۔

> ان حالات میں اول تو کسی جماعت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا صحیح نہیں۔ اور اگر اس شوق کو پورا ہی کرنا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو کم از کم احمدیوں کے اس گروہ کو اس سے مستثنیٰ کرنا ضروری ہے جو حضرت خاتم النبیینؐ کے بعد کسی بھی نبی کے آنے کے قائل نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے حق میں ہیں۔ ہمارے نزدیک قادیانی ہو یا غیر قادیانی ہر کلمہ گو مسلمان ہے۔ اس کو غیر مسلم قرار دینا کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

آپ نے دیکھا کہ "قادیانی" اور "لاہوری" اصل میں دونوں ایک ہیں۔ ان کا باہمی نزاع، جنگ زرگری سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ ہم نے اسی بنا پر تجویز کیا تھا کہ قانون یہ پاس ہونا چاہیئے کہ مرزا غلام احمد کو مسلمان سمجھنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

(۰)

## مقام نبوت

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۵ء میں جو تجویز پیش کی تھی کہ مرزا غلام احمد کے متبعین کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے، اور جسے قانونی حیثیت ستمبر ۱۹۷۴ء میں مملکت پاکستان میں دی گئی۔ وہ کس قدر مبنی برحقیقت اور خود مرزا صاحب کے مسلک کے عین مطابق تھی۔ لیکن قطع نظر ان قانونی مباحث کے، مرزا صاحب کے دعوئے نبوت نے خود منصب نبوت کی اس قدر تذلیل کی ہے جس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ انہوں نے نبوت جیسے بلند و بالا منصب کو، جو شرف و مجد انسانیت کی معراج کبریٰ ہے، انتہائی پست سطح پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ہم نے شروع میں بتایا ہے کہ بہاولنگر کے ڈسٹرکٹ جج محمد اکبر مرحوم نے اپنے فیصلہ میں کہا تھا کہ انہوں نے مقام نبوت کو بیسوے ایک تحریر سے سمجھا اور اسی بنا پر اپنا فیصلہ صادر کیا۔

میں نے اس کے بعد مقام نبوت کے متعلق اپنی کتاب "معراج انسانیت" میں بڑی شرح وبسط سے لکھا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ میں اس سلسلہ میں اس کا ایک اقتباس آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ میں نے اس میں لکھا ہے۔

نبوت کا مقام اس قدر عظیم المرتبت ہے کہ اس کے تصور سے روح میں بالیدگی، نگاہوں میں بصیرت، ذہن میں جلا، قلب میں روشنی، خون میں حرارت، بازوؤں میں قوت، ماحول میں درخشندگی، فضا میں تابندگی، اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ نبی کا پیغام انقلاب آفریں، دین و دنیا کی سرفرازیوں اور سربلندیوں کا امین ہوتا ہے۔ وہ مُردوں کی بستی میں صور اسرافیل پھونک دیتا ہے اس سے قوم کے عروقِ مفلوج میں بھرے خونِ حیات رقص کرنے لگ جاتا ہے۔ وہ اپنی ملت کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے اور ان کے ایک ہاتھ میں زمین کی خلافت اور دوسرے میں آسمان کی بادشاہت تھما دیتا ہے۔ وہ اپنی ہوش ربا تعلیم اور محیر العقول عمل سے باطل کے تمام نظام ہائے کہنہ کی بنیادیں اکھیڑ کر، آئین کائنات کو ضابطۂ خداوندی پر متشکل کر دیتا ہے۔ اس سے زندگی ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ آرزوئیں آنکھیں ملتی ہوئی اٹھتی ہیں۔ ولولے جاگ پڑتے ہیں۔ ایمان کی حرارتیں، دلوں میں سوز اور جگر میں گداز پیدا کرتی ہیں۔ روح کی مسرتوں کے چشمے اُبلتے ہیں۔ قلب و جگر کی نورانیت کی سوتیں پھوٹتی ہیں۔ تازہ امیدوں کی کلیاں چٹکتی ہیں۔ زندہ مقاصد کے غنچے کھلتے ہیں اور اس خوش بخت قوم کا صحنِ چمن، دامانِ صد باغبان و کفِ ہزار گلفروش کا فردوسی منظر پیش کرتا ہے۔ حکومتِ الٰہیہ کا قیام اس کا نصب العین اور قوانینِ خداوندی کا نفاذ اس کا منتہیٰ ہوتا ہے جب اس کے ہاتھوں خدا کی بادشاہت کا تخت اجلال بچھتا ہے تو باطل کی ہر طاغوتی قوت پہاڑوں کے غاروں میں منہ چھپاتی پھرتی ہے۔ جور و استبداد کے قصر فلک بوس کے کنگورے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ طغیان و سرکشی کے آتشکدے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کی قدوسی جماعت کے ساتھ اعلائے کلمۃ الحق کے لئے باہر نکلتا ہے تو فتح و ظفر اس کی رکاب چومتی ہے۔ شوکت و حشمت اس کے جلو میں چلتی ہے۔ سرکشی اور خود پرست قوتیں اس کے خدائے واحد القہار کا کلمہ پڑھتی ہیں اور خدا اور اس کے فرشتے ان انقلاب آفریں ملکوتی کارناموں پر تحسین و تبریک کے پھولوں کی بارش کرتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ۔

یہ تھا مقام نبوت جسے شیخ عبدالحق سے اکتساب ضیاء کے بعد میں نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد ہمارے سامنے ایک مدعی نبوت آتا ہے جس کی ساری عمر انگریزوں جیسی ابلیسی سیاست کی حامل قوم کی غلامی کی تلقین و تائید میں گزر جاتی ہے۔ وہ لیفٹیننٹ گورنر بہادر کو درخواستوں پر درخواستیں گزارتا ہے کہ میں نے آپ کی اس قدر

خدمت کی ہے، آپ اس کے صلہ میں میری حفاظت بھی کریں اور خصوصی مراعات سے بھی نوازیں! سوچئے عزیزانِ من! کہ اس سے نبوت کو کس مقام پہ لے آیا گیا ہے؟ یہی وہ احساس تھا جس سے تڑپ کر اقبالؒ نے کہا تھا کہ۔

فتنۂ ملت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

مقامِ نبوت کے تعارف کے بعد، میں نے اپنی مذکورہ صدر کتاب میں لکھا تھا۔

> مقامِ نبوت تو ایک طرف، شمع نبوتؐ سے اکتسابِ ضیا کرنے والے مردِ مومن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی نگاہوں سے قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ ایک اللہ کے سوا کسی کا خوف اس کے دل تک نہیں پہنچ سکتا۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں اس کی شمشیر جگرداد کے سامنے لرزہ براندام ہوتی ہیں۔ اس کی قوتِ بازو حکومتِ خداوندی کے تمکن و بقا کی ضامن ہوتی ہے۔ وہ قوانینِ خداوندی کا عملاً نفاذ کرتا ہے۔ یہ وہ "مجدد" ہوتا ہے جس کی قوتِ ایمانی اور بصیرتِ قرآنی سے محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے عہدِ سعادت مہد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ وہ "مسیحا" ہوتا ہے جس کے اعجازِ نفس سے مردہ قوم میں ازسرِنو زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ یہ وہ "مہدی" ہوتا ہے جو خود اللہ کے صراطِ مستقیم پر گامزن ہو کر ساری دنیا کے لئے ہدایت و رشادت کا موجب بن جاتا ہے۔ یہی وہ مرکز ہوتا ہے جس کے گرد اسی جماعت کا دائرہ کھنچ جاتا ہے جس کے متعلق فرمایا کہ۔
>
> يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ... (۵/۵۴)
>
> اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے۔ وہ مومنوں کے سامنے جھکے ہوتے اور مخالفین کے مقابل میں غالب ہوتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرنے والے۔

## مومنین کی جرأتِ ایمانی

حضرات انبیاء کرام کا مقام تو ایک طرف رہا، عام مومنین کی جرأتِ ایمانی کی کیا کیفیت ہوتی ہے، اس کے لئے خود قرآنِ کریم نے ایک واقعہ درج کیا ہے جو حریت و عظمت کی ہزار داستانیں اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جب ساحرینِ دربارِ فرعون نے صداقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ کر خدا پر ایمان کا اعلان کر دیا تو فرعون نے بڑی گرج دار آواز میں دھمکی دی اور کہا کہ تمہیں یہ جرأت

کس طرح سے ہوگئی کہ میری اجازت کے بغیر ایمان کا اعلان کر دو؟ تم دیکھو کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ میں تمہیں حوالہ دار و رسن کر دوں گا اور تمہارے ایک ایک حصہ بدن کو کٹوا کر الگ کر دوں گا۔ ان مومنین نے (جنہیں ایمان لائے ابھی چند ثانیے ہی گزرے تھے) اس قہر آلود دھمکی کو نہایت سکون و سکوت کے ساتھ سنا اور ایک تبسم زیرِ لب کے ساتھ کہا۔ فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ (۲۰/۷۲)۔ جو تیرے جی میں آئے کر لے۔ اِنَّا آمَنَّا بِرَبِّنَا۔ ہم اپنے رب پر ایمان لے آئے ہیں اور پھر تو ہمارے ساتھ کر بھی کیا سکتا ہے۔ إِنَّمَا تَقْضِي هَٰذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا۔ تیرا دائرۂ اختیار ہماری اسی دنیاوی زندگی تک ہے اور زندگی تو یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ آگے بھی چلتی ہے۔ اور اُس دائرے تک تجھے رسائی ہی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے تو ہمیں ڈرا کس بات سے ہے!

یہ ہوتی ہے مومنین کی جرأتِ ایمانی! اس کے برعکس اس مدعیٔ نبوت کی "جرأتِ ایمانی" کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگائیے۔ مرزا صاحب نے جب اپنے ان الہامات کی تشہیر و اشاعت کی جن میں اپنے مخالفین پر خدا کے عذاب کی وعید تھی تو بٹالہ کے مولوی محمد حسین (مرحوم) نے ان کے خلاف زیرِ دفعہ (۱۰۷) تعزیراتِ ہند ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گورداسپور کی عدالت میں استغاثہ دائر کر دیا۔ دفعہ (۱۰۷) کے تحت اگر جرم ثابت بھی ہو جائے تو سزا پھانسی نہیں ہوتی، ضمانتیں ہو جاتی ہیں۔ لیکن مرزا صاحب کی "جرأت" ایمانی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے عدالت میں معافی نامہ داخل کر دیا جس کے الفاظ یہ تھے۔

> میں مرزا غلام احمد قادیانی بحضور خداوند تعالیٰ بانشراحِ صدر اقرار کرتا ہوں کہ آئندہ:
>
> (۱) میں آئندہ ایسی پیش گوئی شائع کرنے سے پرہیز کروں گا جس کے یہ معنی ہوں یا ایسے معنی خیال کئے جا سکیں کہ کسی شخص کو (یعنی مسلمان ہو خواہ ہندو ہو یا عیسائی وغیرہ) ذلت پہنچے گی یا وہ موردِ عتابِ الٰہی ہو گا۔
>
> (۲) میں خدا کے پاس ایسی اپیل (فریاد و درخواست) کرنے سے بھی اجتناب کروں گا کہ وہ کسی شخص کو (یعنی مسلمان ہو یا ہندو یا عیسائی وغیرہ) ذلیل کرنے سے یا ایسے نشان ظاہر کرنے سے کہ وہ موردِ عتابِ الٰہی ہے، یہ ظاہر کرے کہ مذہبی مباحثہ میں کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔
>
> (۳) میں کسی چیز کو الہام بنا کر شائع کرنے سے مجتنب رہوں گا جس کا یہ منشا ہو یا جو ایسا منشا رکھنے کی معقول وجہ رکھتا ہو کہ فلاں شخص (یعنی مسلمان ہو خواہ ہندو یا عیسائی وغیرہ) ذلت اٹھائے گا یا موردِ عتابِ الٰہی ہو گا۔۔۔۔
>
> (۴) جہاں تک میرے احاطۂ طاقت میں ہے میں تمام اشخاص کو جن پر کچھ میرا اثر یا اختیار ہے، ترغیب دوں گا کہ وہ بھی بجائے خود اسی طریق پر عمل کریں جس طریق پر کاربند ہونے کا میں نے دفعہ ۱ تا ۳

میں اشتہار کیا ہے۔

العبد
مرزا غلام احمد بقلم خود

گواہ شد
خواجہ کمال الدین
بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

دستخط۔ جے۔ ایم۔ ڈوڈی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ۱۴ فروری ۱۸۹۸ء

سچ کہا تھا اقبال نے کہ :-

میں نہ عارف نہ مجدد نہ محدث نہ فقیہ — مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
ہاں مگر عالمِ اسلام پہ رکھتا ہوں نظر — فاش ہے مجھ پہ ضمیرِ فلکِ نیلی فام
عصرِ حاضر کی شبِ تار میں دیکھی میں نے — یہ حقیقت کہ ہے روشن صفتِ ماہِ تمام
وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

والسلام

---

لاہور میں
محترم پرویز صاحب کا درس قرآن کریم
ہر اتوار کی صبح ۸½ بجے
بمقام ۲۵-بی۔ گلبرگ۔ لاہور میں منعقد ہوتا ہے

# شہرۂ آفاق کتابیں جن سے صحیح اسلام سمجھ میں آ سکتا ہے

## ۱۔ من و یزداں

خدا پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ قرآن و دیگر اہلِ مذاہب کے خدا پر ایمان کو ایمان کیوں تسلیم نہیں کرتا۔ قرآن خدا کا کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس خدا کا ہم سے ساتھ کیا تعلق ہے۔

قیمت مجلد:۔ پچیس روپے

## ۲۔ ابلیس و آدم

پہلا انسان کس طرح وجود میں آیا۔ قصۂ آدم کا مفہوم کیا ہے۔ ابلیس و آدم کی کشمکش۔ شیطان۔ ملائکہ جنات۔ وحی۔ نبوت، رسالت جیسے اہم مذہبی نظریات کا صحیح تصور، علومِ حاضرہ کی روشنی میں۔

قیمت مجلد:۔ بیس روپے

## ۳۔ جوئے نور

حضرات انبیاء کرام اور اقوامِ سابقہ کی سرگذشتیں، آسمانی انقلاب کے خلاف، مفاد پرست گروہوں کا محاذ۔ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داروں کی تباہ کاریاں۔ (حضرت نوحؑ سے حضرت شعیبؑ تک)

قیمت مجلد:۔ بیس روپے

## ۴۔ برقِ طور

صاحبِ ضربِ کلیمؑ اور فرعونیت کی آویزش۔ داستانِ بنی اسرائیل۔ قوموں کے عروج و زوال کے ابدی اصول۔ شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی۔ یہودی ذہنیت اور اس کا انجام۔ کیا یہودیوں کی مملکت کبھی قائم نہیں ہو سکتی؟ ارضِ مقدس کی داستان۔ قیمت مجلد:۔ بیس روپے

## ۵۔ شعلۂ مستور

حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات۔ کیا حضرت عیسیٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ کیا وہ زندہ آسمان پر تشریف فرما ہیں۔ کیا وہ پھر سے زمین پر اتریں گے؟ عقیدہ تصلیب کی حقیقت کیا ہے۔ قرآن کریم اور عصرِ حاضر کے محققین کے نزدیک۔ بصیرت افروز حقائق، حقیقت کشا معلومات۔ قیمت مجلد پچیس روپے۔

## ۶۔ ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت

مقامِ نبوت کیا ہے؟ ختمِ نبوت کی حقیقت اور اہمیت کیا ہے؟ سلسلۂ وحی کیوں بند کیا گیا؟ رسالتِ محمدیہ کس طرح ابدیت دیکنار ہے؟ آنے والے کا عقیدہ کس طرح پیدا ہوا۔ تحریکِ احمدیت کی اصل حقیقت اور غرض و غایت۔ احمدی لٹریچر کا بے لاگ تجزیہ اور تنقید۔ بڑی اہم کتاب ہے۔

قیمت مجلد:۔ پندرہ روپے

نوٹ:۔ قیمتوں میں محصول ڈاک شامل نہیں ہے۔

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور

شاہد عادل

# کیا مزارعت ناجائز اور مکان کا کرایہ ربوٰ ہے؟

اس غریب قوم کے اصطبل میں جو "سفید ہاتھی" بندھے ہوئے ہیں، ان میں سے ایک ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد ہے۔ اس ادارے پر اس کے انچارج وزیر کی تصریح کے مطابق اب تک ڈیڑھ کروڑ روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ کے ایک ادارے، ایشاء فاؤنڈیشن کی جانب سے بھی لاکھوں روپے کی امداد مل چکی ہے [1] اس ادارے (تحقیقات اسلامی) کے بارے میں یہ دعوے کیا جاتا ہے کہ اسلامی علوم کے متخصص اور عہد حاضر کے گوناگوں پیچیدہ نظریاتی معاملاتی اور اخلاقی مسائل سے باخبر افراد کی ایک پوری جماعت دن رات لکھنے پڑھنے، بحث و تمحیص اور غور و فکر میں مصروف ہے۔ لیکن عجیب بات ہے اور جیسا کہ ادارے کے انچارج وزیر نے اعتراف کیا ہے، ابھی تک عوام کے اس ادارے کی کوئی ایسی تحقیق نہیں پہنچی، جس نے ان کے کسی پیچیدہ نظریاتی یا معاملاتی مسئلہ کو حل کر دیا ہو۔

پچھلے دس بارہ سال میں اس ادارے نے جو تحقیقاتی تخلیقات پیش کی ہیں قارئین طلوع اسلام اس کی جھلکیاں وقتاً فوقتاً ملاحظہ کرتے رہے ہیں۔ مثلاً جب ادارہ کی پہلی عربی کتاب "رسائل قشیریہ" ہمارے پاس تبصرے کے لیے آئی تو ہم سناٹے میں آ گئے۔ قطع نظر اس سے کہ تصوف کی اس قدیم عربی کتاب کی اشاعت سے اس غریب قوم کا کونسا پیچیدہ نظریاتی یا معاملاتی مسئلہ حل ہوگا، یہ کتاب پہلے ہی مصر میں شائع ہو چکی تھی اور ہمارے ہاں بازار میں ساڑھے چار روپے میں بک رہی تھی۔ ادارہ کی جانب سے اس کی قیمت (غالباً) دس روپے مقرر کی گئی تھی [2] جب تبصرہ کرنے کی بجائے ہم نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب جو اس وقت اس ادارے کے ڈائریکٹر تھے، کی خدمت میں اس کا مصری ایڈیشن پیش کیا تو فرمانے لگے، اچھا مصر والوں نے اسے ہم سے پہلے شائع کر دیا ہے! ہمارا خیال تھا کہ ہمارا یہ تبصرہ ادارہ کو تحقیقی تخلیقات شائع کرنے پر مائل کر دے گا۔ جن سے اس ملک کے غریب عوام کے کوئی نظریاتی یا معاملاتی مسائل حل ہوں لیکن ہماری حیرت کی انتہاء نہ رہی۔ جب کچھ عرصہ بعد اسی قدیم مصنف کی تصوف کے موضوع پر ایک اور ضخیم کتاب، "رسالہ قشیریہ" کا اردو ترجمہ شائع کر دیا حالانکہ اس کتاب کے دو ترجمے، حیدر آباد (دکن) اور ہندوستان سے پہلے ہی شائع ہو چکے تھے۔ ہم نے ادارے کے ڈائریکٹر سے گزارش کی کہ اور کچھ نہیں ہو سکتا تو اسلام کے معاشی نظام پر ہی کوئی تحقیقی لٹریچر تیار کرائیے۔

---

[1] اخبارات میں ایشاء فاؤنڈیشن کے متعلق یہ انکشاف ہو چکا ہے کہ اس کا تعلق امریکہ کے مشہور زمانہ ادارے سی۔ آئی۔ اے سے تھا۔ اس لیے اکثر ممالک میں اس فاؤنڈیشن کے دفاتر بند کر دیے گئے۔

[2] ادارہ کی حالیہ فہرست میں اس کی قیمت یہی لکھی ہے۔ (طلوع اسلام)

زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پر ایک مستقل تصنیف کی ضرورت تھی۔ جس کے لیے ظاہر ہے کہ بڑی محنت درکار تھی۔ لیکن ادارہ نے ایک آسان طریقے پر عمل کرکے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ وہ یوں کہ امام ابوعبید کی کتاب الاموال کا اردو ترجمہ شائع کر دیا حالانکہ اس کا بھی اردو ترجمہ اس سے پہلے حیدرآباد (دکن) سے شائع ہو چکا تھا۔ ادارے کے ایک اور سلسلہ یعنی مجموعۂ قوانین اسلام کے معرکہ آرا ہونے کے بارے میں بڑے بلند بانگ دعوے کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس میں اسلامی قانون کا جو حشر کیا گیا ہے۔ قارئین اس کی جھلکیاں طلوع اسلام کے صفحات میں دیکھ چکے ہیں۔

ادارہ تحقیقات اسلامی کے اس قسم کے تحقیقی کارناموں کی وجہ سے ہم اس کی کارکردگی سے بڑی حد تک مایوس ہو گئے تھے۔ تاہم پچھلے سال ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہمیں جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ وہ یوں کہ پچھلے دنوں جب روسی ادیبوں کا ایک وفد پاکستان کا دورہ کرنے آیا تو کوئی من چلا انہیں ادارہ تحقیقات اسلامی میں بھی لے گیا۔ اس وفد کے سامنے ادارے کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے بتایا گیا کہ اس کے قیام کا مقصد مسلمانان پاکستان کو اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل بنانا ہے۔ اس پر روسی وفد کے قائد نے پوچھا کہ کیا اس مقصد کے لیے ادارے نے اسلامی طرز زندگی کے اصولوں کو متعین کر لیا ہے اور پھر ان کے مطابق اہل پاکستان کی زندگیوں کو ڈھالنے کے لیے کیا اقدامات کیے گئے ہیں۔ تو اس پر ادارہ کی اسلامی علوم کے تخصصین کی یہ جماعت ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگی۔

روزنامہ نوائے وقت کی اس رپورٹ نے طلوع اسلام کے قلب حساس پر گہری چوٹ لگائی۔ اور اس نے اپنی اگست ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں ان نظریاتی، معاملاتی اور اخلاقی مسائل کی فہرست اس ادارہ کے سامنے رکھ دی، جو تحقیق طلب ہیں۔ علمی حلقوں نے طلوع اسلام کے ان پیش کردہ نکات کو سراہا۔ لیکن ادارہ کی جانب سے ایک لفظ بھی نہ کہا گیا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ ادارہ کے ایک ذمہ دار رکن نے ایک اہم مسئلہ کیطرف اپنی توجہ مبذول کی۔

- یہ مسئلہ مزارعت کی شرعی حیثیت کے بارے میں ہے۔ جس کا تعلق ملک کے کروڑوں انسانوں سے ہے۔

مزارعت کو ہم نے اہم ترین مسئلہ اس لیے کہا ہے کہ اس وقت دنیا کے ماہرین معاشیات نے بھی کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے ایک بہت بڑے ماہر معاشیات مسٹر گنار میرڈل کو اس مسئلہ پر تحقیقی مطالعہ کے لیے پاکستان بھیجا۔ اس نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف ایشائی ڈرامہ میں اس مسئلہ پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے اور پاکستان میں غلے کی کمی پر قابو پانے کے لیے اپنی تجاویز پیش کی ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ان کی تجاویز بڑی حد تک اسلامی تعلیمات کے مطابق ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ہاں انہیں کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی۔ سیاسی لحاظ سے اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ پچھلے انتخابات سے لگایا جا سکتا ہے اور آئندہ انتخابات میں بھی اس کے ہمہ گیر اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ایسے اہم مسئلے پر ادارے کی تحقیق اس بات کی حقدار ہے کہ اسپر گہری نظر ڈالی جائے۔

یہ مقالہ ادارہ کے ایک فاضل متخصص جناب محمد صغیر حسن معصومی کے قلم سے ادارہ کے ترجمان ماہنامہ فکر و نظر کی دسمبر ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ معصومی صاحب کچھ عرصہ پہلے تک ادارے کے ڈائریکٹر تھے اور اب غالباً ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں۔ ان کے مقالے کا عنوان ہے "کیا مزارعت ناجائز اور مکان کا کرایہ ربوا ہے"۔ اس مقالے پر نظر ڈالنے سے پہلے ہم ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ فقہی قوانین کے مطابق پاکستان کی اراضی مفتوحہ ممالک کے ذیل میں آتی ہے۔ جس کی رو سے یہاں کی تمام اراضی اسلامی مملکت (پاکستان) کی ملکیت

قرار پاتی ہے۔ جب تک برصغیر ہندوپاک پر مسلمانوں کی حکومت رہی اسی کے مطابق عمل ہوتا رہا۔ دوسرے الفاظ میں زمین کا معاملہ کاشتکار اور حکومت کے درمیان براہ راست ہوتا تھا۔ آج کی طرح درمیان میں غیر حاضر زمینداروں کا کوئی طبقہ نہیں تھا۔ زمینداروں کا یہ طبقہ لارڈ کارنوالس کے بنگال کے بندوبست دوامی کے بعد پیدا ہوا اور اسے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد موروثی حیثیت عطا کردی گئی۔ یہ ایک ایسی مشہور حقیقت ہے۔ جسے مفتی محمد شفیع صاحب جیسے قدامت پسند عالم دین نے بھی اپنی کتاب "اسلام کے نظام اراضی" میں تسلیم کیا ہے۔ اس لئے ہمیں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس وضاحت کے بعد ہمارے لئے مزارعت یعنی زمین کی بٹائی کی شرعی حیثیت کا تعین ایک نظریاتی بحث کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق غیر مفتوحہ ممالک سے رہتا ہے جس کے ذیل میں صرف اراضی عرب آتی ہیں مفتوحہ ممالک کہ جن میں برصغیر ہندوپاک کی اراضی بھی شامل تھیں) فقہی اصطلاح میں خراجی اراضی کہلاتی تھیں جن پر بٹائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اتنے واضح شرعی احکامات کے باوجود اس مسئلہ پر غلط مبحث پیدا کرکے ہمارے ہاں بھی غیر حاضر زمینداری کا جواز ثابت کیا جاتا ہے۔ اور ادارہ تحقیقات اسلامی کے فاضل محقق نے بھی ایسا کرنے کی سعی ناکام کی ہے۔ بحث کا آغاز کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بعض دوستوں کا خیال ہے کہ مزارعت ناجائز ہے۔ اور انھیں اصرار ہے کہ مکان، زمین اور کھیت کا کرایہ سود ربا ہے۔ (صفحہ ۲۲۶) پھر اپنی دانست میں مزارعت کا جواز ثابت کرچکنے کے بعد فرماتے ہیں کہ مکان کا کرایہ بھی اسی نوعیت کا معاملہ ہے اس لئے مزارعت پر قیاس کرتے ہوئے وہ بھی جائز ہے (صفحہ ۲۵۲)

جیسا کہ مقالہ کے عنوان سے ظاہر ہے' فاضل محقق کو ثابت تو یہ کرنا تھا کہ یہ معاملات ربا یعنی سود کی تعریف میں نہیں آتے لیکن سارے مقالہ میں انہوں نے اس کا نام تک نہیں لیا۔ یہاں تک کہ ان معاملات کو سود قرار دینے والے ارشادات نبوی پر بھی پردہ ڈالتے ہوئے بعض ایسی روایات کو نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ جن کی صحت خود ان کے نزدیک مشکوک ہے۔ ان کی تفصیلات ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ اس مقام پر ہم اتنا ضروری سمجھتے ہیں کہ حضور صلعم کے ان ارشادات کو نقل کردیں۔ جن میں آپ نے واضح الفاظ میں مزارعت یعنی زمین کی بٹائی کے معاملے کو سود قرار دیا ہے۔ ہم یہ احادیث سنن ابوداؤد سے نقل کرتے ہیں کہ اس مجموعے میں ہر حدیث کی صحت اور کمزوری کے بارے میں ساتھ ہی ساتھ تصریح کردی گئی ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل احادیث کو صحیح قرار دیا گیا ہے

(۱) عن ابن ابی نعیم حدثنی رافع بن خدیج انہ زرع ارضاً فمر بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو یسقیھا فسألہ لمن الزرع ولمن الارض۔ فقال زرعی ببذری وعملی۔ لی الشطر ولبنی فلان الشطر فقال اربیتما۔ فرد الارض علی اھلھا وخذ نفقتک۔

(سنن ابوداؤد مطبوعہ جلد ۲ صفحہ ۲۵۵)

(ترجمہ) ابن ابی نعیم سے روایت ہے کہ مجھ سے حضرت رافع بن خدیج نے بیان کیا کہ اس نے ایک زمین کاشت کی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں سے گزر ہوا اور وہ کھیتوں کو پانی دے رہا تھا۔ تو آپ نے دریافت فرمایا کہ زمین اور کھیتی کس کی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ بیج اور کام کی شرط پر یہ کھیتی میری ہے اس میں ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک فلاں کا۔ تو آپ نے فرمایا کہ آپ دونوں نے سود کا معاملہ کیا۔ زمین مالکوں کو واپس کردو اور ان سے اپنے اخراجات لے لو۔

(۲) عن جابر بن عبداللہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من لم یذر المخابرۃ فلیأذن بحرب من اللہ ورسولہ ۔ (ایضاً)

(ترجمہ) حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جو شخص زمین کی بٹائی چھوڑنے پر تیار نہیں، وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی کیلئے تیار ہو جائے (دیکھئے وہ اسلامی حکومت کا باغی ہے)

لطف کی بات یہ ہے کہ یہ صحیح احادیث بھی حدیث کی انہی کتابوں میں موجود ہیں۔ جن سے فاضل محقق نے اپنے مطلب کی نسبتاً کمزور احادیث نقل کی ہیں۔ اس کمزوری کا انہیں خود احساس ہے، اس لئے ان روایات کے بارے میں انہیں یہ تصریح کرنی پڑی:۔

"چونکہ یہ حدیثیں صحیحین نیز صحاح ستہ کے دوسرے مجموعوں میں مذکور ہیں جن کے راویوں کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ ان کی روایتیں قابل قبول ہیں۔ اس لیے اس بحث میں پڑنا فضول معلوم ہوتا ہے کہ فلاں راوی کو فلاں نے قابل جرح قرار دیا ہے۔ اور فلاں نے ان کے عقیدے کو اہل السنت والجماعۃ کے عقیدے کے خلاف بتایا ہے۔ کیونکہ معاصرین اپنے عہد کے لوگوں کی علمی حیثیت برتری یا فضیلت کو مشکل سے قابل اعتنا سمجھتے ہیں۔ اور کچھ نہ کچھ عیب جوئی ضرور کرتے ہیں" (ماہنامہ فکر ونظر دسمبر ۶۴ء، صفحہ ۴۳۰)

دیکھئے اپنی غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے جو حضور صلعم کے واضح اور صحیح ارشادات کے خلاف ہے، ادارہ کے فاضل محقق نے اسماء الرجال کے پورے سرمایہ پر قلم پھیر دیا ہے، اور وہی مودودی صاحب والی منطق اختیار کر لی ہے۔ یعنی اپنے مطلب کے خلاف حضور صلعم کی سچی احادیث کو رد کر کے ان کے مقابلے میں ضعیف احادیث کا سہارا لیا۔ فاضل محقق کی ان کمزور روایات میں ان کے ضعف سے قطع نظر جو تناقض پایا جاتا ہے۔ اس کے متعلق ہم آگے چل کر مختصراً عرض کریں گے۔ یہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضور صلعم نے زمین کی بٹائی کو جو سودی معاملہ قرار دیا ہے۔ تو کیا وہ اس تعریف کے ذیل میں بھی آ جاتا ہے جو ماہرین معاشیات نے سود کی متعین کی ہے۔ موجودہ دور کے ایک عظیم ماہر معاشیات لارڈ کینز (KEYNS) سود کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

وہ اعلیٰ معاوضہ جو قدیم زمانے میں اراضی پر اور عہد حاضر میں سرمائے پر وصول کیا جاتا ہے
(اسلام اور سود از انور اقبال قریشی صفحہ ۸۹)

حقیقت یہ ہے کہ سود کی جو تعریف بھی سامنے رکھی جائے وہ اس معاملے کا احاطہ کرتی ہے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں نے بھی جو زمین کی بٹائی کو اسلام میں جائز قرار دیتے ہیں، سود کی جو تعریف متعین کی ہے، یہ معاملہ اس میں شامل نظر آتا ہے۔ ایک ایسی تعریف ملاحظہ فرمائیے:

تجارت اور صنعت وحرفت اور زراعت میں انسان محنت اور ذہانت صرف کرتا ہے اور اس کا فائدہ لیتا ہے، مگر سودی کاروبار میں وہ محض اپنا ضرورت سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت و مشقت اور صرف کال کے دوسروں کی کمائی میں شریک غالب بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت اصطلاحی شریک کی نہیں ہوتی جو نفع ونقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے، اور نفع میں جس کی شرکت نفع کے تناسب سے ہوتی ہے بلکہ وہ ایسا شریک ہوتا ہے جو بلحاظ نفع ونقصان اور بلا لحاظ تناسب نفع اپنے مقرر اور مشروط منافع کا دعویدار

ہوتا ہے۔ (سود حصہ اوّل طبع سوم صفحہ ۱۹۴ مصنفہ مودودی صاحب)

اس تعریف کی روشنی میں دیکھیے کہ صاحب سرمایہ (زمین کا مالک) بغیر کسی محنت و مشقت اور صرف کمال کے محنت کرنے والے شخص (کاشتکار) کی محنت میں کس طرح شریک غالب بن جاتا ہے۔ بلکہ یہ زمین کی بٹائی والا سودی معاملہ تو بنک کے سود سے بھی زیادہ نفع بخش اس لیے زیادہ سنگین دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وضاحت اس مثال سے ہو گی کہ اگر کوئی شخص ملازمت کے دوران آٹھ دس ہزار روپے کی بچت کر لیتا ہے اور وہ اپنی اس بچت کو کسی بنک میں جمع کرا کے نفع حاصل کرتا ہے تو ان حضرات کے نزدیک وہ متفقہ طور پر حرام ہے۔ لیکن اگر وہ شخص اس رقم کو بنک میں جمع کرانے کی بجائے اس کی زرعی اراضی خرید کر کسی کسان کو بٹائی پہ دے دے۔ اور بغیر کسی محنت و مشقت کے اس کسان کی سال بھر کی محنت کی کمائی میں شریک غالب بن جائے تو اسے یہ حضرات شیر مادر کی طرح حلال قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف زمین سے بغیر محنت و مشقت حاصل کی ہوئی یہ آمدنی بنک کے سود سے نہ صرف یہ کہ کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ نفع بخش بھی اور وہ یوں کہ جہاں اراضی کی قیمت سال بسال بڑھتی جاتی ہے بنک میں جمع شدہ سرمایہ کی قدر اس کی شرح سود سے بھی زیادہ کم ہوتی جاتی ہے۔

پچھلے دنوں ادارہ کے انچارج وزیر نے ادارہ کے اسلامی علوم کے متعلقین کو خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ ادارہ کی تحقیقات عوام تک نہیں پہنچ سکیں۔ لیکن زیر تبصرہ "تحقیق" کو سامنے رکھتے ہوئے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ خود ادارہ کے فاضل محققین بھی ادارہ کی تحقیقات کو شرف مطالعہ نہیں بخشتے۔ مثلاً ادارہ کے ایک سابق ڈائریکٹر نے جب بنک کے سود کے جواز کے لیے بحث اٹھائی تو ادارہ کے اسی ترجمان یعنی "فکر و نظر" میں حضور صلعم کے مذکورہ بالا زمین کی بٹائی کو سود قرار دینے والے ارشادات کئی بار شائع ہوئے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ نگار کی نظر سے وہ ارشادات نہیں گزرے ورنہ وہ انہیں نقل کر کے ان کا کوئی شافی سا جواب تو دیتے، یا کم از کم اپنے مقالے کا اختتام ان الفاظ پر تو نہ فرماتے کہ کسی نے ایسے کرایہ کی رقم کو ربو یعنی سود سے تعبیر نہیں کیا، اور نہ کرائے کی اجرت کو کوئی عقل سلیم ربو و سود کہہ سکتی ہے۔

کیا ہی اچھا ہوتا جو فاضل مقالہ نگار عقل سلیم کی کوئی تعریف متعین کر دیتے۔

اب ہم ان روایات پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہیں جو ادارہ کے اسلامی علوم کے متخصص نے حضور صلعم کے بٹائی کو سود قرار دینے والے ارشادات کے مقابلے میں پیش کی ہیں۔ ائمہ حدیث کے مطابق جس روایت کے راوی مجروح ہوں وہ صحت کے معیار سے گر جاتی ہے۔ ان روایات کا مجروح ہونا تو خود فاضل مقالہ نگار نے تسلیم کیا ہے۔ لیکن ان میں صرف یہی ایک نقص نہیں بلکہ ان میں سے اکثر میں تناقض پایا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت ابن عباسؓ سے اس بارے میں چار پانچ احادیث روایت کی جاتی ہیں۔ جن کے راوی حضرت طاؤس ہیں فاضل محقق ان روایات کا سہارا لینے کیلئے پہلے حضرت ابن عباسؓ کے بلند مقام کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"حضرت ابن عباسؓ کے قول سے اور حبر الامۃ ہیں اور حضور صلعم کی دعاؤں کی برکت سے شرعی احکام کو خوب سمجھتے تھے" (صفحہ ۳۴۱)

اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ کی سب سے وزنی روایت نقل کرتے ہیں جس کا اردو ترجمہ یہ ہے:-

عمرو بن دینار، حضرت طاؤس سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے طاؤس سے کہا کہ اے ابو عبد الرحمٰن کاش آپ مخابرہ (زمین کی بٹائی) ترک کر دیتے کیونکہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخابرہ سے منع فرمایا ہے۔ طاؤس نے جواب دیا کہ ان میں سب سے بڑے علم والے یعنی حضرت ابن عباسؓ نے مجھے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع نہیں فرمایا۔ البتہ حضور نے فرمایا تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو اپنی زمین عطا کر دے تو یہ یقیناً بہتر ہے اس سے کہ اس زمین پر سے ایک معلوم و معین رقم پیداوار لے۔ (صفحہ ۳۴۲)

قارئین نے دیکھ لیا کہ حبر الامۃ حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت، صرف یہ کہ حضرت طاؤس سے مروی ہے۔ بلکہ بٹائی کے معاملے کی وضاحت بھی خود انہی کی جانب سے ہے۔ ادھر فقہائے امت کا یہ فیصلہ ہے کہ حضرت طاؤس ان بزرگان امت میں سے ہیں جو زمین کی بٹائی کی ہر شکل کو حرام قرار دیتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود فاضل محقق چار صفحات پہلے حضرت طاؤس کا یہ حرمت والا مسلک نقل کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو مقالہ ۲۰) غلط! فاضل محقق کی نقل کردہ کردہ روایات میں صرف ان کے راوی ہی مجروح نہیں بلکہ ان میں تناقض بھی پایا جاتا ہے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ مقالہ نگار نے کچھ صحیح احادیث بھی نقل کی ہیں لیکن ان سے استدلال غلط کیا گیا ہے۔ مثلاً بٹائی کے جواز کے لیے خیبر کے واقعہ کی مثال پیش کرتے ہیں۔ ترجمہ ملاحظہ ہو:

ہماری دلیل (جواز مزارعت کی) حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل خیبر سے معاملہ (کھیتوں اور کھجوروں کے باغ) کا کیا کہ کھیتی اور کھجوروں کی پیداوار کا ایک حصہ دیں گے۔ اس حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے روایت کیا ہے، اور اس روایت کو ابن عباسؓ اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے بھی بیان کیا ہے (صفحہ ۳۴۵)

درحقیقت یہ حدیث ہی الٹا استدلال ہے۔ فاضل محقق اپنے مضمون کے شروع میں (صفحہ ۳۲۰ پر) یہ تسلیم کر آئے ہیں کہ جب اس حدیث کے راوی حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کو رافع بن خدیج کی بٹائی کے معاملے سے منع کرنے والی حدیث پہنچی تو آپ نے بٹائی کو فوراً ترک کر دیا۔ یعنی جس صحابی کا سہارا لیکر اس سودی معاملے کو جائز قرار دینے کی کوشش کی جا رہی ہے انہوں نے خود اس معاملے کو ترک کر دیا تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر حضرت عبد اللہ بن عمر بٹائی کو جائز سمجھتے تھے تو جب یہ حدیث ان تک پہنچی تو انہوں نے بٹائی کے جائز معاملے کو ترک کرنے کی بجائے یہ دلیل کیوں نہ دی جب حضور نے عملاً اہل خیبر کے ساتھ یہ معاملہ کیا تھا تو دوسرے لوگ اسے روکنے والے کون ہیں؟ بلکہ اس کے برعکس آپ نے خیبر کے معاملے کی یہ وضاحت کر کے کہ وہ بٹائی نہیں بلکہ حکومت کا خراج تھا۔ اس سودی معاملہ کو جائز قرار دینے والوں کی جڑ کاٹ دی تھی۔ علامہ شوکانی حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا مسلک نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لیکن پیداوار کی بٹائی کے ناجائز ہونے پر مذکورہ بالا اصحاب ان احادیث سے استدلال کرتے ہیں جو اس کی مخالفت میں وارد ہوئی ہیں اور خیبر کے معاملے کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ خیبر تو بزور شمشیر فتح ہوا تھا اور اس کے باشندے آنحضرت کے غلام ہو چکے تھے اس لیے ان کی پیداوار میں سے جو کچھ بھی آپ نے لیا وہ بھی آپ ہی کا تھا اور جو کچھ چھوڑ دیا وہ بھی آپ ہی کا تھا۔ علامہ حازمی فرماتے ہیں کہ یہ مسلک حضرت عبد اللہ

بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت رافع بن خدیج اور حضرت اسید بن حضیر اور حضرت نافع رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور اسی کی طرف امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور اہل کوفہ میں سے حضرت امام ابو حنیفہؒ گئے ہیں (نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار جلد ۵ صفحہ ۲۹۵)۔

لیکن حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ اور جلیل القدر فقہائے امت کے اس فیصلے کو ادارہ تحقیقات اسلامی کے فاضل محقق رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ حضورؐ نے خیبر کے کھیتوں اور باغات کو نصف پیداوار کے عوض یہود مالکوں کے قبضے میں رہنے دیا تھا۔ یہ معاملہ کسی طرح سیاسی نہیں تھا اور نہ خراج کی شکل تھی (صفحہ ۲۴۳)

ہماری سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ہاں مسائل علمی بنیادوں پر حل کرنے کے بجائے شخصیات کے حوالے سے لیا کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں سب سے پہلے مودودی صاحب نے خیبر کے واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے زمین کی بٹائی کے سودی معاملے کو جائز قرار دینے کا اعلان کیا تھا اس کے بعد جن اہل علم کو کسی وجہ سے ان سے عقیدت تھی وہ آنکھیں بند کر کے اس واقعہ کا سہارا لیتے چلے گئے اور اتنا بھی غور کرنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ خود اس واقعہ کے راوی اس بارے میں کیا کہتے ہیں اور اس سودی معاملے کے بارے میں ان کا کیا مسلک تھا۔ مودودی صاحب کا حوالہ آگیا ہے تو ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کا مسلک خود ان کے الفاظ میں نقل کر دیا جائے خیبر کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

یہ عہد نبوت و خلافت کے مشہور ترین واقعات میں سے ہے اور اس کی صحت میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ اس میں صریح نص پر دیکھا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بٹائی پر زمین کاشت کیلئے دی ہے۔
(مسئلہ ملکیت زمین صفحہ ۶۹)

اس سے چند صفحات پہلے اس سودی معاملے کو جائز قرار دینے کے لیے رسول اللہ صلعم کی سیرت اور خلفاء راشدین کے عمل کا یوں واسطہ دیتے ہیں:۔

پھر کوئی ایسا شخص جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و شخصیت اور آپ کے خلفائے راشدین کی زندگی اور آپ کے صحابہ کرامؓ کے حالات سے واقفیت رکھتا ہو۔ یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ ان لوگوں میں سے تھے جو زبان سے ایک چیز کو غلط کہیں اور اسے رائج رہنے دیں اور زبان سے ایک دوسرے طریقے کو برحق کہیں اور عملاً اس کو جاری نہ کریں۔ (صفحہ ۶۴)

چنانچہ خیبر کے واقع سے استدلال کرتے ہوئے مودودی صاحب نے نہ تو اس واقعہ کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی وضاحت کو قابل اعتنا سمجھا اور نہ ان صحابہ کرامؓ اور ائمہ اسلامؒ کے فیصلے کو کوئی اہمیت دی جنہوں نے اس کے مطابق فتوے دیئے جو علامہ شوکانی کی زبانی ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔

لیکن جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ حق حق ہے اس کو جتنا چھپایا جائے وہ چھپ نہیں سکتا۔ مودودی صاحب نے خیبر کے واقعہ کے راوی اور مشہور صحابیؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی وضاحت تو رد کر دی۔ بلکہ بٹائی کو نا جائز قرار دینے والے صحابہ کرامؓ اور مذاہب فقہ کے بانیوں پر بالواسطہ طور پر یہ الزام بھی عائد کر دیا کہ نعوذ باللہ وہ حضور صلعم کی

سیرت و شخصیت سے پوری طرح آگاہ نہیں تھے۔ لیکن سلف صالحین کے ساتھ اس زیادتی کے باوجود ایک اور مقام پر جب انہیں ایک اور بات ثابت کرنی تھی تو وہ خیبر کے معاملے کے بارے میں اصل حقیقت بھی تسلیم کر گئے کہ وہ خراج کا معاملہ تھا۔ انہی کی زبانی سنئے:۔

وہ جن کو راستبازی اور انصاف کی ہوا تک نہ لگی تھی، ان کے عدل و راستی کا یہ حال ہو گیا کہ خیبر کی صلح کے بعد جب ان کا تحصیلدار سرکاری مطالبہ وصول کرنے گیا تو یہودیوں نے اس کو ایک بیش قرار رقم اس غرض کیلئے پیش کی کہ وہ سرکاری مطالبہ میں کچھ کمی کر دے۔ مگر اس نے رشوت لینے سے انکار کر دیا اور اور یہودیوں کے درمیان پیداوار کا آدھا آدھا حصہ اس طرح تقسیم کیا کہ دو برابر کے ڈھیر آمنے سامنے لگا دیئے اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے جس ڈھیر کو چاہیں اٹھا لیں۔

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم طبع ہفتم صفحہ ۲۲۹)

ادارہ کے اسلامی علوم کے متخصص نے خیبر کے واقعے کے بارے میں اور اس مقام کی وضاحت تو کر دی لیکن اب جبکہ اس واقعہ کا سہارا لینے والے بھی اس اٹل حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ تو کیا وہ اپنے اس کمزور استدلال پر دوبارہ غور کرنے کی زحمت گوارا کریں گے؟

دوسری طرف اگر خیبر کے واقعہ کی تفصیلات پر ایک نظر ڈالی جائے تو اس معاملے کا سرکاری خراج ہونے کے علاوہ بھی اس سے مزارعت کے سلسلے میں سرے سے استدلال کیا ہی نہیں جا سکتا۔ کیونکہ وہ فی نفسہ مزارعت کا معاملہ تھا ہی نہیں۔ بلکہ مساقات کا معاملہ تھا۔ یعنی اجناس بونے اور کاشت کرنے کی بجائے صرف درختوں کو پانی دینے کا معاملہ۔ آگے چلنے سے پہلے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ خود فقہائے امت کی زبانی ان مختلف معاملات کی تعریف نقل کر دی جائے تاکہ جو لوگ غلط بحث کے ذریعے سود کو جائز قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں وہ بے نقاب ہو جائیں۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

والمزارعة ان يعقد على الارض لمن يزرعها بجزء معلوم مما يخرج منها والبذر من المالك فان كان من العامل فهي المخابرة وهي باطلة كذا المزارعة الا في البياض بين النخل او العنب ان عسر سقيها الا بقيه۔

(متن التحریر شیخ الاسلام زکریا انصاری صفحہ ۱۴۳)

(ترجمہ) اور مزارعت اس معاملے کا نام ہے جو زمین پر کام کرنے کیلئے مالک اور کاشتکار کے درمیان طے پایا ہے کہ کاشت کرنے والے کو پیداوار کا ایک متعین حصہ ملے جبکہ بیج مالک کی طرف سے ہو۔ اور اگر بیج کاشتکار کی طرف سے ہو تو اس معاملے کا نام مخابرہ ہے جو باطل یعنی حرام ہے۔ اسی طرح مزارعت بھی باطل ہے۔ لیکن اگر کھجوروں اور انگوروں کے باغات میں کچھ ایسی خالی جگہ ہو جو ان درختوں کو سیراب کرنے سے خود بخود سیراب ہو جاتی ہو تو اس پر جائز ہے۔

خیال رہے کہ فقہاء کی تصریح کے مطابق یہ جواز بھی صرف ان زمینوں تک محدود ہو گا کہ جو خراجی نہ ہوں یعنی اراضی عرب۔ جبکہ یہ خیبر کی اراضی خراجی زمینوں کے زمرے میں شامل تھیں۔

لیکن ان واضح احکاماتِ شریعت کے باوجود ہمارے ہاں کی زمین کی بٹائی کے معاملہ کو جو فقہاء کی اصطلاحات کے مطابق مخابرہ کے ضمن میں آتا ہے، خیبر کے مذکورہ بالا مساقات والے معاملے پر قیاس کر کے جائز قرار دیا جاتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان وہ بنیادی فرق کہ جس سے ایک معاملہ جائز ہو جاتا ہے اور دوسرا حرام، ظاہر ہے۔ مساقات میں کاشتکار کو صرف درختوں کو پانی دینا ہوتا ہے۔ اسے اپنی جیب سے ایک پائی بھی خرچ کرنی نہیں پڑتی۔ اس لیے نقصان کی صورت میں سب کچھ مالک کا جاتا ہے، کاشتکار کا کوئی نقصان نہیں ہوتا، بلکہ اسے معمولی سے اخراجاتِ زندگی بھی دیئے جاتے ہیں۔ اسی لیے فقہاء نے مساقات پر مضاربت کے معاملے کو قیاس کرتے ہوئے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ اس کے برعکس بٹائی کے معاملے میں مالک کی صرف زمین ہوتی ہے جبکہ اس میں بیج اور کاشتکاری کے آلات و جانوروں کا انتظام کاشتکار کو کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے نقصان کی صورت میں مالک کا تو کچھ نہیں جاتا اور کاشتکار کی نہ صرف سال بھر کی محنت ضائع جاتی ہے بلکہ بیج اور جانوروں کی صورت میں اس نے جو سرمایہ لگایا ہوتا ہے وہ بھی تباہ ہو جاتا ہے۔ اس معاملے میں زمین کے مالک کا سرمایہ جو زمین کی شکل میں ہے، بنک سے بھی زیادہ محفوظ رہتا ہے۔ کیونکہ بنکوں کے فیل ہو جانے کا خطرہ ہمیشہ موجود رہتا ہے، جبکہ اراضی کی قیمت بالعموم بڑھتی رہتی ہے۔

**مضاربت کے اصول پر جواز:** ہم ابھی بیان کر آئے ہیں کہ فقہاء نے مساقات کے معاملے پر قیاس کرتے ہوئے مضاربت کے جواز کا فتویٰ دیا لیکن قرآن و سنت میں اس معاملے کی کوئی اصل نہیں ملتی۔ علامہ شوکانی امام ابن حزم کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"قال ابن حزم فی مراتب الاجماع کل ابواب الفقہ فیہا اصل من الکتاب والسنۃ حاشا القراض فما وجدنا لہ اصلاً فیہا البتۃ" (نیل الاوطار جلد ۵ صفحہ ۲۸۲)

(ترجمہ) امام ابن حزم مراتب الاجماع میں فرماتے ہیں کہ فقہ کے ہر باب کی اصل کتاب و سنت میں مل جاتی ہے۔ لیکن مضاربت کے معاملہ کی ایسی کوئی اصل ہم نے کتاب و سنت میں نہیں پائی۔

مضاربت کی مشہور تعریف یہ ہے کہ دو فریقوں میں ایسا معاملہ کہ جس میں ایک فریق کی جانب سے سرمایہ مہیا کیا جائے اور دوسرا کام کرنے کا ذمہ دار ہو۔ نفع اگر ہو تو یہ دونوں فریق مقررہ حصص کے مطابق بانٹ لیں، لیکن اگر نقصان ہو تو وہ سب کا سب صاحبِ سرمایہ پر ہوگا، بلکہ الٹا کام کرنے والے کو سرمائے سے متوسط قسم کے اخراجات بھی ادا کیے جائیں گے۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۳ صفحہ ۴۴ اور موطا امام مالک
مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۸۸)

یہ تعریف مساقات کے معاملہ سے تو ضرور ملتی جلتی ہے اس لیے اس کے جواز کا فتویٰ اسی پر قیاس کر کے دیا گیا۔ لیکن ہمارے ہاں کی مروجہ بٹائی کے معاملہ سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ یعنی مضاربت میں جہاں محنت کرنے والے فریق کا کوئی نقصان نہیں، سب نقصان صاحبِ سرمایہ کے پلے ڈالا جاتا ہے، مروجہ بٹائی میں نقصان کی صورت میں صاحبِ سرمایہ (زمیندار) کا کچھ بھی نہیں جاتا، بلکہ اس کے برعکس محنت کرنے والے فریق کی نہ صرف محنت ضائع ہوتی ہے بلکہ بیج اور آلاتِ کشاورزی اور جانوروں کی صورت میں اس کا لگایا ہوا سرمایہ بھی غارت جاتا ہے۔ اس کے باوجود، ادارہ تحقیقات اسلامی کے اسلامی علوم کے متخصص اسے مضاربت پر قیاس کر کے جائز قرار دیتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ امام ابو یوسف نے مزارعت کو مضاربت کے مثل قرار دیا ہے۔ (صفحہ ۳۴۸) چونکہ امام ابو یوسف صاحب کا یہ قول ان کے مفید مطلب تھا اس لیے نہ تو انھوں نے یہ دیکھنے کی تکلیف گوارا کی کہ ان معاملات میں

ایسی مشترک بنیادیں موجود ہیں جن کی بنا پر زمین کی بٹائی کو مضاربت پر قیاس کیا جا سکتا ہے یا نہیں؛ حالانکہ اگر امام ابویوسفؒ کے فتوے کو سامنے رکھا جائے تو ان کے دوسرے استدلال کی ساری عمارت دھڑام سے گر پڑتی ہے۔ امام صاحب نے اپنے فتوے کی تائید میں کوئی شرعی دلیل نہیں دی بلکہ لوگوں کی ضرورت کا واسطہ دیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ یجوز علی اصول المضاربۃ لحاجۃ الناس الیہا۔ لوگوں کی ضرورت کی بنا پر یہ مضاربت کے اصول پر جائز ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس معاملے کے جواز کے لیے ناقل محقق نے جو کمزور روایات نقل کی ہیں یا خیبر کے واقعہ سے غلط استدلال کیا ہے۔ امام ابویوسف کے نزدیک ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں (ورنہ وہ ضرور ان کا حوالہ دیتے) بلکہ انھوں نے لوگوں کی ضرورت کو بنیاد بنا کر اس کے جواز کا فتویٰ دیا۔

**معاشرے کی ضرورت کی دلیل:-** مضاربت پر قیاس کے سلسلے میں مزید گفتگو سے پہلے ہم معاشرے کی ضرورت کی دلیل کا جائزہ لیتے ہیں کیونکہ آج بھی ہم اسی "ضرورت کی دلیل" کی بنا پر ایک اہم سوال سے دوچار ہیں، اور وہ ہے بنک کے سود کا جواز۔ ہمارے موجودہ معاشرے کی بنیاد سرمایہ داری نظام پر ہے، سود جس کی ریڑھ کی ہڈی ہے اور آج ہمارے معاشرے میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو کسی نہ کسی طرح سودی معاملات میں ملوث نہ ہو۔ اس ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اکثر اسلامی ممالک کے بہت سے علماء نے جن کا کچھ نہ کچھ تعلق حکومتوں سے تھا، بنک کے اس سود کے جواز کے فتاویٰ جاری کئے لیکن کیا موجودہ سرمایہ دار معاشرے کی ایک اہم ضرورت ہونے کے باوجود علماء کی اکثریت نے اس کے جواز کو تسلیم کیا ہے؟ ٹھیک اسی طرح جب خلافت راشدہ کے بعد اسلامی مملکت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی اور جاگیرداری اور زمینداری کا نظام مسلط ہو گیا (اور آج کے سود کی طرح) زمین کی بٹائی کا معاملہ ملوکیت کے پیدا کردہ معاشرہ کی اہم ضرورت بن گیا، تو بعض فقہاء نے جن کا حکومتوں سے تعلق تھا، لوگوں کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے جواز کا فتویٰ دیا۔ لیکن اسی ملوکیت کے پیدا کردہ معاشرہ میں ہمارے دوسرے ائمہ عظام بھی موجود تھے جنھوں نے ہر قسم کے تشدد کے باوجود ان حکومتوں میں کسی قسم کے عہدے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور واضح الفاظ میں اس سودی معاملے کو ناجائز اور باطل قرار دے دیا۔ (تفصیل اس کی گزر چکی ہے۔) کیا فرماتے ہیں اس بارے میں وہ حضرات جو آج "معاشرہ کی ضرورت" کی دلیل کی رُو سے سود جیسے معاملہ کو حلال قرار دینے پر آمادہ رہتے ہیں؟

**قیاس کی شرائط کی خلاف ورزی:-** قارئینِ طلوعِ اسلام اس امر سے بخوبی واقف ہوں گے کہ فقہائے امت میں سے احناف نے قیاس کو زیادہ تر استعمال کیا ہے جبکہ دوسرے ائمہ نے اس کی شرعی حیثیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ لیکن اہلِ قیاس نے اس کے استعمال کے لیے کچھ اصول و قواعد مقرر کیے ہیں جن پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر قیاس کے لیے ان مقررہ شرائط کا خیال نہ کیا جاتا تو اس قیاس کو غلط قرار دے دیا جاتا۔ قیاس کے لیے مقرر کردہ شرائط میں سے سب سے بنیادی شرط یہ ہے کہ جس معاملے پر کسی دوسرے معاملے کو قیاس کیا جائے، تو پہلے معاملے کے بارے میں قرآن و سنت میں واضح شرعی احکام ہونے چاہئیں۔ اصولِ فقہ کی اصطلاح میں اسے یوں کہتے ہیں کہ مقیس علیہ منصوص اور مقیس غیر منصوص ہونا چاہیئے۔ یعنی معاملے کو قیاس کیا جائے اس بارے میں قرآن و سنت میں کوئی حکم نہ ملتا ہو۔ لیکن جب بٹائی کے معاملہ کو مضاربت پر قیاس کیا جاتا ہے تو صورت قیاس کی شرائط کے الٹ ہو جاتی ہے۔ یعنی مقیس علیہ مضاربت خود غیر منصوص ہے یعنی قرآن و سنت میں اس کے بارے میں کوئی صریح حکم نہیں ملتا۔ جبکہ مقیس یعنی زمین کی بٹائی کا معاملہ (جسے غیر منصوص ہونا چاہیئے تھا) منصوص ہے۔ یعنی اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات موجود ہیں جو اسے قرآن کے سود کو حرام قرار دینے والے حکم کے ذیل میں لے آتے ہیں۔ اس لیے خود اہلِ قیاس کی شرائط کے مطابق مزارعت کو مضاربت پر قیاس نہیں کیا

جا سکتا۔

**ائمہ عظام کے مسلک پر پردہ ڈالنے کی کوشش۔** جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں عوام تو ایک طرف خود ادارہ کے فاضل اراکین بھی خود ادارہ کی تحقیقات سے استفادہ نہیں فرماتے۔ مثلاً ادارہ کے ترجمان فکر و نظر کی اگست ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں اسی موضوع پر ایک مقالے میں امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے اقوال کو بڑی تفصیل سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ بٹائی کے معاملے کو غیر مشروع یعنی حرام قرار دیتے تھے۔ اب یا تو یہ اقوال فاضل محقق کی نظر سے نہیں گزرے یا وہ انھیں جاننے کے باوجود ان سے چشم پوشی کر رہے ہیں اور انھیں نقل کیے بغیر یا کوئی دلیل دیئے بغیر اپنے مقالہ زیر تبصرہ میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ امام مالکؒ بٹائی کے معاملہ کو جائز قرار دیتے تھے۔ (صفحہ ۲۳۸) حالانکہ ان کا بٹائی کو جائز قرار دینے والا مسلک خود ان کی تصنیف "موطا" میں موجود ہے، اور علامہ شوکانی کے حوالے سے ہم اسے نقل بھی کر چکے ہیں۔ اس کے مقابلے میں امام ابوحنیفہؒ کا حرمت والا قول اتنا مشہور ہے کہ فقہ کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس میں وہ نہ پایا جاتا ہو۔ ان کے اس قول کا انکار تو ممکن نہ تھا لیکن مقالہ نگار ایک دوسرے طریقے سے اسے کم اثر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

فرماتے ہیں:-

"امام ابوحنیفہ اور ابراہیم نخعی وغیرہ کے اقوال صحیح اور ظاہر یہ ہے کہ غایت تقوی پر محمول ہیں۔" (صفحہ ۲۴۹)

ہمارے خیال میں ادارہ تحقیقات اسلامی کے اسلامی علوم کے متخصص کی حضرت امام ابوحنیفہؒ کے قول کے وزن کو اس طرح کم کر کے ایک سودی معاملے کو جائز قرار دینے کی کوشش، ان صاحب پر اتہام سے کم نہیں۔ کیونکہ جہاں بھی امام صاحب کا قول نقل ہوا ہے اس میں آپ نے بٹائی کے معاملے کو ایسے واضح الفاظ میں حرام، باطل اور فاسد قرار دیا ہے کہ ان کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی۔ مثلاً حنفی فقہ کی ایک بہت مشہور کتاب بدائع الصنائع میں یہ مسلک یوں بیان کیا گیا ہے:-

قال ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ انہا غیر مشروعۃ وبہ اخذ الشافعی۔ (جلد ۶ صفحہ ۱۷۵)

(ترجمہ: امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ زمین کی بٹائی کا معاملہ حرام ہے اور یہی امام شافعیؒ کا مسلک ہے۔)

یہ ہے ادارہ تحقیقات اسلامی کے اسلامی علوم کے متخصص کی تحقیق کہ جس کی رو سے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سود قرار دیئے ہوئے معاملے کو جائز قرار دینے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

**مکانات کا کرایہ۔** اب ہم مکانات کے کرایہ کے مسئلہ کو لیتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے اگر ہم فاضل محقق کے اصول ہی کو سامنے رکھ لیں تو بحث مختصر ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اسے مزارعت پر قیاس کرتے ہوئے جائز قرار دیتے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں:-

"مزارعت کی شرعی حیثیت کی وضاحت کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تعمیر کیے ہوئے مکان کو مقررہ رقم پر کرایہ پر دینا کسی مقررہ وقت وفائدہ کے لیے ایسا معاملہ ہے جس کے جواز میں کسی کو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ معاملہ مزارعت ارض بالذہب والفضہ کے مثل ہے۔" (صفحہ ۳۵۲)

اب جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بٹائی کا معاملہ سود ہے یہاں تک کہ اس کی تائید آج کل کے ماہرین معاشیات کی مقرر کردہ تعریف سے بھی ہوتی ہے۔ بلکہ ایسے اہل علم نے بھی جنہوں نے بٹائی کو جائز قرار دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور

لگایا ہے، سود کی جو تعریف کی ہے، بٹائی کا معاملہ اس کے ذیل میں بھی آتا ہے۔ بنابریں خود فاضل محقق کے قائم کردہ استدلال کے مطابق مکان کا کرایہ بھی سود قرار پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں بعض ایسی احادیث مل جاتی ہیں جن میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سود قرار دیا ہے۔ لیکن ادارہ کے فاضل محقق نے جس طرح بٹائی کی بحث میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اسے سود قرار دینے والے ارشاد کو پس پردہ ڈال دیا، مکان کے کرایہ کے سلسلہ میں بھی انھوں نے اپنے اسی "اصول" پر عمل کیا، حالانکہ حنفی فقہا تک نے اس فرمانِ نبوی کو نقل کیا ہے:۔

من اکل کراء ارض مکۃ فکانما اکل الربٰو۔

(ہدایہ مطبوعہ دہلی جلد ۴ صفحہ ۴۵۷)

(ترجمہ) جس نے مکہ مکرمہ کے مکانوں کا کرایہ کھایا۔ اس نے گویا سود کھایا۔

پھر فاضل محقق کی دیدہ دلیری ملاحظہ ہو کہ اپنی طرف سے انھوں نے پوری کوشش کی ہے کہ عامۃ الناس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کا پس منظر نہ چلے جن میں آپ نے زمین کی بٹائی اور مکانات کے کرائے وغیرہ کو سودی معاملات قرار دیا ہے۔ اس کے بعد یہ صاحب سینہ تان کر اعلان کرتے ہیں کہ کسی نے ایسے کرائے کی رقم کو ربٰو و سود سے تعبیر نہیں کیا اور نہ کرائے کی اُجرت کو کوئی عقلِ سلیم ربٰو و سود کہہ سکتی ہے۔ (صفحہ ۴۵)

ایسا کچھ کہنے کی جرأت ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے اسلامی علوم کے متخصصین کو ہی ہو سکتی ہے۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ غیر مسلم ماہرین معاشیات کی تحقیقات سے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کی تائید ہوتی ہو، لیکن ہمارے محقق اس کے متعلق یہ کچھ کہنے کی جرأت کریں۔ کیسا انوکھا اندازِ تحقیق ہے جس پر اس غریب قوم کا اب تک ڈیڑھ کروڑ روپیہ خرچ ہو چکا ہے اور اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

---

**طلوع اسلام:۔** طلوع اسلام میں قرآن کے معاشی نظام کے سلسلہ میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اسے یک جا کرنے سے ضخیم جلدات تیار ہو سکتی ہیں۔ ان تحریروں سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے زمین پر انفرادی ملکیت جائز ہی نہیں۔ زمین رزق کا ذریعہ ہے جس کا انتظام (اسلامی مملکت کے زیر نگرانی) اس طرح ہونا چاہیئے کہ کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔ اس حقیقت کی روشنی میں زمین کے متعلق اس قسم کی بحثوں کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ لیکن اس کے باوجود ہم ایسے مقالات کو اس لیے شائع کرتے رہتے ہیں کہ:۔

۱۔ اس وقت وہ اسلامی مملکت قائم نہیں جس میں تمام کاروبارِ حکومت قرآن حکیم کے مطابق سرانجام پائے۔

۲۔ حکومت نے اس قسم کے ادارے (مثلاً اسلامی مشاورتی کونسل اور اس کے ذیل میں ادارہ تحقیقات اسلامیہ وغیرہ) اس لیے قائم کر رکھے ہیں کہ وہ اپنی تحقیقات کی رو سے حکومت کو بتائیں کہ ایسے اہم معاملات میں اسلام کا حکم یا رہنمائی کیا ہے۔ جب یہ ادارے ایسی تحقیقات پیش کرتے ہیں جو قرآن حکیم کے خلاف جاتی ہیں تو ہمیں خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ حکومت ان تحقیقات سے متاثر ہو کر اس خود فریبی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ اسلام یہی ہے اور ظاہر ہے کہ افراد کی غلط فہمی کے مقابلہ میں حکومت کی غلط فہمی بڑے خطرناک نتائج کا موجب ہوتی ہے۔ اس لیے جب اس قسم کے ادارے ایسی خلافِ قرآن تحقیق پیش کرتے ہیں تو ہمارا فریضہ ہو جاتا ہے کہ ہم ان کی تردید شائع کریں۔

ہے۔ ہم نے اس ادارہ کو اکثر "سفید ہاتھی" سے تعبیر کیا ہے اور مندرجہ بالا مقالہ میں، صاحب مقالہ نے بھی اس تشبیہ کو دہرایا ہے۔ یہ تشبیہ کسی ضد یا مخالفت کی زائیدہ نہیں بلکہ ایسی حقیقت پر مبنی ہے جس کا اب خود ارباب بست و کشاد کو بھی اعتراف ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ ادارہ اب وفاقی وزیر محترم کوثر نیازی صاحب کے زیر کنٹرول آ گیا ہے۔ انہوں نے اپنی نئی وزارت کا قلمدان سنبھالنے کے بعد اس ادارہ کا معائنہ فرمایا اور اس کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار اسی وقت، ارباب ادارہ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی تقریر میں فرما دیا۔ ان کی یہ تقریر مجلہ فکر و نظر کی اشاعت بابت فروری ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی ہے جسے ہم درج ذیل کرتے ہیں۔ محترم نیازی صاحب نے ابتدائی تعارفی کلمات کے بعد کہا:۔

## کوثر نیازی صاحب کی تقریر:۔

اب تک جہاں تک میرے تجزیے کا تعلق ہے۔ جب سے یہ ادارہ قائم ہوا ہے یعنی ۶۰-۶۱ سے لے کر اب تک اس پر تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپیہ خرچ ہو چکا ہے اور اس ڈیڑھ کروڑ روپے کے صرف سے جو نتائج برآمد ہونے چاہئیں تھے وہ برآمد نہیں ہوئے۔ لوگ اور اس غریب ملک کے لوگ ایک ایسے ادارے سے جس کا کام صرف کثیر سے جو تا رہا ہے اس سے کچھ زیادہ نتائج کی توقع رکھتے ہیں۔ جہاں تک قدیم علمی کتابوں کو ایڈٹ کر کے چھاپنے کا تعلق ہے یہ کام اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مگر ملک میں ایسے ادارے موجود ہیں جو یہ کام کر رہے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔ خود محکمہ اوقات نے بھی (بعض صوبائی محکمہ ہائے اوقات نے بھی) یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے اور انہوں نے بھی ایسی کتابیں شائع کی ہیں۔ پھر بعض ایسے ادارے ہیں جن کو حکومت کی طرف سے ایڈ دی جاتی ہے اور وہ اپنے طور پر اس طرح کا کام کر رہے ہیں۔ بعض پرائیویٹ ادارے بھی ایسا کام کر رہے ہیں۔ تو یہی اصل کام اس ادارے کا نہیں ہے۔

رہے بعض علمی موضوعات جن پر اس ادارے نے کام کیا ہے تو یقیناً وہ کام قابل قدر ہے۔ مگر جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ آپ مجھ سے تو یہ توقع رکھتے ہیں کہ میں جانوں کہ آپ کے ادارے نے مجموعہ قوانین اسلام اتنی جلدوں میں شائع کیا ہے اور یہ یہ کتابیں شائع کی ہیں۔ لیکن اس ملک میں انگلیوں پر ایسے لوگ گنے جا سکیں گے۔ میں بلا مبالغہ کہہ رہا ہوں، جو اس بات کو جانتے ہیں۔ اس میں کوتاہی کہاں ہے۔ رسیل آرگنائز نہیں ہوئیں، اشتہار میں کی کار کردگی میں کمی ہے۔ مطبوعات کی پبلسٹی نہیں ہو سکی۔ انہیں ایڈورٹائز نہیں کیا جا سکا۔ یا ہمارے ملک میں مانگ کم ہے ایسی علمی کتابوں کی۔ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ مانگ کم ہونے کی بات تب صادق آتی ہے جب پہلے لوگ جان تو سکیں کہ ایسی کوئی کتابیں آپ کے ہاں شائع ہوئی ہیں لیکن پڑھے لکھے لوگوں کو جانتا ہوں جنہیں یہی معلوم نہیں کہ آپکے ہاں سے کوئی ایسی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ یا آپکے ہاں سے کوئی ایسے جرائد شائع ہوتے ہیں۔ آپنے فکر و نظر کا نام لیا۔ اور آپ نے اسلامک اسٹڈیز اور الدراسات کا نام لیا۔ لیکن کتنے لوگ ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ یہ جرائد نکلتے ہیں۔

ایسے علمی جرائد یہاں پاکستان سے شائع ہوتے ہیں، دینی جرائد بھی اور علمی جرائد بھی، کہ جن کی تعداد ہزاروں میں ہے، ہزاروں کی تعداد میں وہ چھپتے ہیں۔ اگر ہمارے ملک میں ایسے حلقے موجود نہ ہوں جو ان جرائد کی قدر کرتے ہیں تو وہ جرائد بھی شائع نہیں ہونے چاہئیں۔ اتنی بڑی تعداد میں جتنی بڑی تعداد میں وہ چھپتے ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ بعض مخصوص سیاسی اور مذہبی اور فرقی حلقے ہیں کہ جن میں ان کی کھپت ہے۔ لیکن آزاد و غیر جانبدار اور کسی گروہ اور کسی حلقے سے منسلک نہ ہونے والے قارئین کی تعداد بھی اس ملک میں بہر حال موجود ہے اور وہ حلقے بھی جن کا مخصوص نقطۂ نظر ہے ان جرائد کو پڑھے بغیر نہیں رہ سکتے اگر ان میں وزن ہو۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس اعتبار سے ہمارا کام بہت پیچھے ہے کہ ہم اپنی مطبوعات اور اپنے جرائد کا تعارف بیرون ملک تو الگ

رہا اندرون ملک بھی نہیں کرا سکے۔ تو ایک کام جس کی طرف اب ہمیں خاص طور پر توجہ دینی ہے وہ یہ ہے کہ ہم جو لٹریچر چھاپتے ہیں، ہم جو جو اندر شائع کرتے ہیں، انھیں اہلِ وطن کے ہاتھوں تک پہنچائیں اور بیرونی دنیا میں بھی ہم ان کا تعارف کرائیں اور ان کی سیل کو منظم کریں۔

دوسری بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ اس ادارے کا بنیادی فنکشن (FUNCTION) ریسرچ ہے، لیکن ریسرچ کے کچھ خاص ہدف معین ہونے چاہئیں۔ ریسرچ ایک وسیع ٹرم ہے اور اگر اس کے مخصوص اہداف معین نہ ہوں تو ساری زندگی کھپ جائے گی اور ریسرچ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکے گا۔ میں یہ چاہوں گا کہ یہ ادارہ جہاں علمی اور دینی موضوعات پر ریسرچ کرے وہاں یہ دو تین باتیں خاص طور پر اس کے پیشِ نظر رہیں اور انشاءاللہ اس سلسلہ میں پروگرام چاک آؤٹ کرانے میں پوری مدد کروں گا۔ اول یہ کہ وہ مسائل جو آج عالمِ انسانی کو درپیش ہیں اور جن کا حل نہ ملنے کی وجہ سے عالمِ انسانی حیران اور سرگرداں ہے۔ ان مسائل کا حل اسلام کیا پیش کرتا ہے اور اس میں تقابلی مطالعہ بھی ہو۔ ان مسائل کو پہلے معین اور مشخص کیا جائے اور اس کے بعد ان موضوعات پر ہم مختلف زبانوں میں لٹریچر تیار کریں جو بلا امتیازِ مذہب ہر پڑھے لکھے انسان کو جو اس دنیا میں رہتا ہے ہم پیش کرنے کے قابل ہو سکیں۔

دوسرا موضوع یہ ہے کہ وہ مسائل جن کا سامنا خاص طور پر عالمِ اسلام کو ہے اور جدید تہذیب اور تمدن کے بطن سے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں اور جن کی وجہ سے ایک عام مسلمان پریشان ہوتا ہے کہ ان کو وہ اپنے دینی احکام سے کیسے تطابق دے، ان میں ریسرچ کی جائے اور ایسے مسائل کا کہ جن سے عالمِ اسلام دوچار ہے ان کا ہم حل پیش کریں اور اس سلسلے میں اگر ضرورت پڑی تو میں اس کی کوشش کروں گا کہ ہم ایسے علمی مذاکرے بھی برپا کریں کہ جن میں ہم بین الاسلامی مفکرین کو دعوت دیں اور ان کے اشتراک سے ان موضوعات پر ہم بحث و تحقیق کریں اور اس کے بعد ان نتائج کو انضباط کے ساتھ ہم دنیا کے سامنے پیش کریں۔

تیسرا ایک شعبہ جس میں اس ادارے کو کام کرنے کی ضرورت ہے، ہرچند کہ اس کا تعلق ریسرچ سے نہیں، وہ یہ کہ ہمارے ملک میں، ویسے تو ہر مسلمان ملک میں، مگر خاص طور پر ہمارے ہاں مذہب کو غلط تصورات اور اوہام کا اسیر بنا دیا گیا ہے۔ بہت سے زوائد کے بوجھ اس پر لاد دیئے گئے ہیں اور نوجوان نسل کو کانسالیڈیٹیڈ فارم (CONSOLIDATED FORM) میں اگر یہ بتایا جائے کہ دین کیا ہے جو اس کے ذہنی شکوک کا ازالہ بھی کر سکے اور اس کے ذہن میں جو سوالات ہیں ان کا جواب بھی دے سکے، اور جو کسی سیاسی غرض سے بھی بالاتر ہو اور جس میں کوئی مخصوص فقہی یا فرقہ وارانہ رنگ بھی نہ پایا جائے۔ ایسا لٹریچر اگر پیش کرنا ہو نئی نسل کے سامنے تو میری نظر میں ایسا لٹریچر موجود نہیں۔ یا تو دین کو کسی ایک شعبے کے گرد گھما دیا گیا ہے اور کل کی تعبیر اور تشریح ایک جزو کی عینک لگا کر کی گئی ہے۔ جیسے سیاست ایک شعبہ زندگی ہے اور ظاہر ہے کہ چونکہ اسلام تمام شعبہ ہائے زندگی سے بحث کرتا ہے کہ وہ سیاست سے بھی بحث کرتا ہے۔ لیکن اس ایک شعبے کے نقطۂ نظر سے دین کے دوسرے تمام شعبوں کی تشریح اور تعبیر کرنے سے اس کا توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔ کچھ اور لوگوں نے دین کو پیش کیا یا تبلیغی لٹریچر لکھا تو اس کے اندر ایسی احادیث اور ایسی روایات اور ایسے فضائل جن میں ایک ایک وظیفہ پڑھنے پر کئی کئی ہزار شہیدوں کا ثواب ملتا ہے، ایسی باتیں درج کی ہیں کہ جن کو ایک نوجوان کا ذہن قبول کرنے سے ابا کرتا ہے اور وہ دین سے قریب ہونے کے بجائے دین سے دور ہوتا ہے۔ تو ہمارے ادارے کا ایک شعبہ ایسا بھی ہو جو ایسا لٹریچر تیار کرے جس میں ہم اسلام کو نوجوان نسل کے لیے قابلِ قبول بنا کر پیش کریں۔ اس کے شکوک کا ازالہ کریں، اس کے سوالات کا جواب دیں، اس کی مخصوص دنیا کو سامنے رکھ کر اور جو لٹریچر بھی آسان زبان میں ہو مختلف زبانوں میں ہو۔ اس کو ہم قیمتاً بھی فروخت کریں۔ اس کو ہم بلا قیمت بھی تقسیم کریں۔ اس کا اہتمام بھی اس ادارے کی

# احوال وکوائف

## ۱۔ جشنِ عیدِ میلاد النبیؐ

امسال بھی حسبِ معمول عیدِ میلاد النبیؐ کی تقریب سعید حسین وسادہ لیکن پُرکشش وجاذب انداز سے منائی گئی۔ ۲۹ مارچ (ہفتہ کی شام) پرویز صاحب کے مکان پر احباب کا اجتماع ہوا جن کی تواضع لطیف ونفیس چائے سے کی گئی۔

اتوار (۳۰ مارچ) کی صبح خصوصی درس کا انعقاد ہوا جس کا موضوع تھا۔ عالمگیر انقلاب کا پیامبر۔ درس گاہ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ کے مرقعات سے مزین تھی۔ دور و نزدیک کے اربابِ ذوق شریکِ محفل تھے۔ خطاب نہایت پرسکون وکیف آمیز فضا میں قریب دو گھنٹے تک جاری رہا۔ اس قسم کے لمحات زندگی میں یادگار رہ جاتے ہیں۔

۲۰ اپریل کی صبح، یومِ اقبال منایا جا رہا ہے۔

---

## ۲۔ مفکرِ قرآن کا دورہ گجرات

بزمِ طلوعِ اسلام گجرات نے بتقریب یومِ اقبال ایک پُرشوکت اجتماع کا انتظام کیا تھا جس میں شرکت کے لئے قرب وجوار کی بزموں کے علاوہ، بزمِ لاہور کے احباب پر مشتمل خصوصی کارواں، بصد ذوق وشوق، ۱۱ اپریل کی صبح گجرات پہنچا۔ مہمانوں کی تواضع کے سلسلہ میں بزمِ گجرات نے ایسی وسیع القلبی کے ساتھ انتظامات کر رکھے تھے کہ یہ تقریب یکسانداز کی سب کنونشن نظر آ رہی تھی۔ جلسہ زمیندارہ بنک کے وسیع ہال میں منعقد ہوا۔ اور کشش کا یہ عالم تھا کہ سامعین نے بہت پہلے سے اپنی نشستیں سنبھال لی تھیں۔ جلسہ کا آغاز تین بجے کے قریب، بصدارت محترم ڈاکٹر اکرم مرزا صاحب ہوا جس میں پرویز صاحب نے "اقبال اور ختمِ نبوت" کے موضوع پر نہایت بصیرت افروز اور معلومات افزا خطاب فرمایا جو قریب دو گھنٹے پر پھیل گیا۔ اجتماع کی فضا از اول تا آخر نہایت پُرسکون، کیف آمیز اور ہیبت آفریں رہا۔ از اں بعد محترم مرزا غلام حسین صاحب کی قیامگاہ پر چائے کے دوران، احباب ہلکی پھلکی گفتگو میں مصروف رہے۔

ہم اس نہایت کامیاب تقریب کے لئے جملہ اراکین بزمِ گجرات کی خدمت میں ہدیہ تبریک وتہنیت پیش کرتے اور اس کے حسنِ انتظام کے لئے بزم کے نمائندہ، محترم شیخ قدرت اللہ صاحب، ڈاکٹر اکرم مرزا، اور مرزا غلام حسین صاحب کو خصوصی شکریہ کا مستحق قرار دیتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان کی ہمتوں میں برکت عطا فرمائے۔

حکومت پاکستان کے منظور شدہ

برآمد کنندگان

# کاٹیج انڈسٹریز

پوسٹ بکس ۲۰۲ - راولپنڈی

کروشیا وغیرہ کا کام کرنیوالی خواتین کیلئے بہترین موقع

مندرجہ ذیل مراکز سے رجوع فرمائیے

۱- مزمل انڈسٹریل ہوم - محلہ فیروز پورہ - راولپنڈی

۲- منور ویلا - لیہ - (ضلع مظفر گڑھ) ضلع مظفر گڑھ میں برآمد کنندگان اسلامی ادارہ



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

United PPI 5742

طلوع اسلام کنونشن ۱۹۷۴ء

# مجلس مذاکرہ

(قسط چہلم)

موضوع:۔ یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

## ۱۴۔ گوگی (ایک چھوٹا سا بچہ)

ایک بچے نے دیکھا کہ قصائی بکری کو کان سے پکڑ کر گھسیٹے لئے جا رہا ہے اور بکری نے چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ بچے نے بکری سے پوچھا کہ تو کیوں چلا رہی ہے یہ تجھے کہاں لئے جا رہا ہے۔ بکری نے کہا کہ یہ مجھے ذبح کرنے کے لئے ذبح خانے لئے جا رہا ہے۔ بچے نے کہا۔ شٹ! میں نے سمجھا یہ تجھے مدرسے لئے جا رہا ہے!!

## ۱۵۔ رانی (دو فقروں کی تقریر)

کہتے ہیں کہ فرعون لڑکوں کو ذبح کرتا تھا، لڑکیوں کو نہیں۔ وہ جہالت کا زمانہ تھا اس لئے لڑکوں اور لڑکیوں میں فرق کیا جاتا تھا۔

ہمارا زمانہ تہذیب کا ہے اس لئے اس میں اس فرق کو مٹا دیا گیا ہے اب لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو یکساں ذبح کیا جاتا ہے۔

## ۱۶۔ نجمہ صفدر

بزرگان کرام۔ سلام و رحمت۔

میری چھوٹی بہن رانی نے ابھی ابھی کہا ہے کہ فرعون لڑکوں کو ذبح کرتا تھا لڑکیوں کو نہیں۔ اب دورِ تہذیب ہے۔ جس میں اس قسم کی عدم مساوات روا نہیں رکھی جا سکتی۔ اس لئے اب لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو ذبح کیا جاتا ہے۔ رانی ابھی بچی ہے جب وہ بڑی ہوگی، اسے عملی زندگی کا تجربہ حاصل ہوگا تو اسے اپنی رائے میں تھوڑی سی ترمیم کرنی پڑے گی۔

اس دورِ تہذیب و تمدن میں لڑکوں اور لڑکیوں میں مساوات ہی قائم نہیں رکھی جا رہی۔ زمانۂ جہالت میں لڑکیوں کے ساتھ جو بے انصافی ہوئی ہے اس کا ازالہ کرنے کے لئے لڑکیوں کو خصوصی توجہ کا مستحق سمجھا جاتا ہے اور

یہ خصوصی توجہ گھر سے شروع ہو جاتی ہے۔
یہ ٹھیک ہے کہ تعلیم بہر حال جہالت سے اچھی ہے لیکن تعلیم مقصود بالذات تو نہیں یہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ لہذا بچوں کو تعلیم دلانے سے پہلے یہ سوچنا اور طے کرنا از بس ضروری ہے کہ وہ مقصد کیا ہے جس کے لئے ہم انہیں تعلیم دلانا چاہتے ہیں لیکن سوچنا سمجھنا اور تعین مقصد کے بعد قدم اٹھانا تو آزاد قوموں کا شیوہ ہوتا ہے۔ غلام قوموں کی ذہنیت بھیڑ چال کی سی ہوتی ہے۔ وہ کوئی کام خود سوچ سمجھ کر نہیں کرتیں۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی کرتی رہتی ہیں۔ یہی حالت ہماری قوم کی ہے۔ چونکہ لڑکیوں کو تعلیم دلانا ہمارے ہاں فیشن سا ہو گیا ہے اس لئے ہر باپ اپنی بچی کو اسکول بھیج دیتا ہے اور کبھی نہیں سوچتا کہ وہاں جس قسم کی تعلیم مل رہی ہے وہ اس کے مستقبل کی تعمیر میں کسی کام بھی آسکے گی؟ سکول کے بعد وہ اسے کالج میں داخل کرا دیتا ہے یہ سوچے بغیر کہ اس سے بالآخر مقصد کیا ہے۔ ہمارے ہاں ابھی لڑکیوں کا مستقبل (HOUSE WIFE) بننا ہوتا ہے لیکن جو تعلیم ان لڑکیوں کو ملتی ہے اس میں اگر کچھ نہیں بتایا جاتا تو یہ کہ وہ ایک اچھی رفیقۂ حیات کیسے بن سکتی ہے اور (علامہ اقبال کے الفاظ میں) اس کے خطِ سیما میں کس طرح آنے والی نسل کی تصویر مضمر ہوتی ہے۔ وہ بس پڑھتی اور امتحان پاس کرتی چلی جاتی ہے اور جب وہ ایم، اے کرنے کے بعد تعلیم سے فارغ ہو جاتی ہے تو اس کی شادی کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے اور یہیں سے اس کی مشکلات کا دور اوّل شروع ہو جاتا ہے۔
شادی کے معاملہ میں ہمارے ہاں مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکی تعلیم یافتہ ہو اور اس کے ساتھ ہی یہ کہ اس کی عمر بڑی نہ ہو۔ ایم۔ اے کرنے تک لڑکی عام طور پر بائیس چوبیس سال کی عمر تک پہنچ جاتی ہے۔ آپ سوچئے کہ ایم۔ اے کی تعلیم اور سترہ اٹھارہ سال کی عمر "کچھ دارد مریّہ" قسم کے یہ مطالبے پورے کس طرح کئے جا سکتے ہیں۔ اس کشمکش میں لڑکی کی عمر اور بڑھتی جاتی ہے اور انتخاب کا دائرہ سکڑتا جاتا ہے وہ جب اپنی اُن چچیری ممیری بہنوں کو دیکھتی ہے جن کی شادی سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں حسب منشا ہو گئی تھی اور اب وہ اپنے اپنے گھروں میں رچ بس چکی ہیں تو اسے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ اس تعلیم سے بالآخر مجھے حاصل کیا ہوا۔ خدا خدا کر کے کہیں بر ملتا ہے تو ان پڑھ ساس نند سے واسطہ پڑ جاتا ہے۔ ان کے دل میں احساس کمتری سے انتقام کے جذبات بیدار ہوتے ہیں تو وہ اس نو وارد میں ہزار کیڑے ڈالنے لگ جاتی ہیں۔ پڑوسنیں پوچھتی ہیں کہ بہن کیسی ہے تمہاری بہو تو چمک کر جواب دیتی ہے کہ کیا پوچھتی ہو تم میری بہو کا! بٹھا رکھی تھی ماں نے لاڈ کر کے گھر میں۔ بڑا چاؤ تھا بیم صاحبہ بنانے کا۔ نہ ہانڈی روٹی کا ڈھنگ، نہ سینے پرونے کا سلیقہ۔ جہیز میں کتابوں کا، ردی اور تصویروں والے رسالوں کی الماری لائی ہے۔ روٹی ساس پکایا کرے گی اور بہو اپنے میاں کو ناول سنایا کرے گی۔ وہ یہ سب کچھ سنتی ہے اور اپنی اس تصویر کو جس میں وہ سیاہ گاؤن پہنے ڈگری ہاتھ میں لئے کھڑی، حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی اور حاشرہ سے پوچھتی ہے کہ اس گاؤن اور ڈگری نے جسے حاصل کرنے کے لئے میں نے اپنے سر کے بال سفید کر لئے تھے بالآخر مجھے کیا دیا؟
اس مقام پر میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ چمک بیٹی ہے آپ بیتی

نہیں - اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اس قسم کا تلخ تجربہ نہیں ہوا - اس لئے اس داستان میں اگر کوئی سقم ہو تو اسے روایت کی غلطی سمجھئے -

بہرحال اگر یہ بیوی اپنے گھر میں الگ رہتی ہے تو صبح سے شام تک گھر کے دھندے، دو ایک بچوں کی دیکھ بھال، اتنی فرصت ہی نہیں دیتے کہ اخبار تک بھی دیکھ سکے - اخبار دیکھنا تو ایک طرف، اسے چٹھی لکھنے کی بھی فرصت نہیں ملتی - اس کی ایم - اے کی ڈگری کا معرف سمٹ سمٹا کر دھوبی کے کپڑے لکھنے یا نوکر کے ساتھ حساب کرنے تک محدود ہو جاتا ہے - اور یہ آپ جانتے یا کم از کم جانتی ہی ہیں کہ جب تعلیم یافتہ گھر کی مالکہ ان پڑھ ملازم سے حساب کرنے بیٹھ جائے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے ؟

یہ ہے ہمارے ہاں کی بے مقصد تعلیم کا ماحصل ! اب آیئے ان لڑکیوں کی طرف جو آرٹس کی بجائے فنی تعلیم حاصل کر کے ڈاکٹر یا انجینئر بن جاتی ہیں - شروع شروع میں تو یہ بہت خوش ہوتی ہیں کہ ہم نے (ECONOMIC INDEPENDENCE) - معاشی آزادی حاصل کر کے مردوں کے تغلب (DOMINATION) سے چھٹکارا حاصل کر لیا لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد یہ خوش فہمی دور ہو جاتی ہے اور یہ ٹھوس حقیقت ابھر کر سامنے آنے لگ جاتی ہے کہ ہمارے معاشرہ میں عورت زندگی بھر مرد کی حفاظت کی محتاج ہوتی ہے - بچپن میں باپ کی، شادی کے بعد خاوند کی، بڑھاپے میں بیٹے کی - مرد کی چھت کے بغیر وہ اپنے آپ کو محفوظ پاتی نہیں اس سلسلے میں میرے سامنے میری ایک سہیلی کی زندگی آتی ہے - اسے ڈاکٹر بننے کا بڑا چاؤ تھا - چنانچہ وہ ڈاکٹر بنی - پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی - تھی وہ بڑی ہونہار - پریکٹس بہت اچھی چلی - وہ اپنی اس زندگی سے بہت خوش تھی لیکن کچھ عرصہ کے بعد حالات نے اسے احساس دلانا شروع کر دیا کہ مرد کی چھت کے بغیر یہ پہاڑ جیسی زندگی کٹے گی نہیں -

خاوند کی تلاش شروع ہوئی تو حلقۂ انتخاب ڈاکٹروں تک محدود رہا - ہمارے ہاں یہ عام غلط فہمی ہے کہ میاں بیوی میں پروفیشن کا اشتراک ہو تو زندگی خوشگوار گزرتی ہے - خوشگوار ازدواجی زندگی کے لئے طبیعت، مزاج اور ذوق کی ہم آہنگی ضروری ہوتی ہے اور محض پروفیشن کا اشتراک اس ہم آہنگی کی ضمانت نہیں ہو سکتا - اگر پروفیشن کا اشتراک خوشگوار تعلقات کی ضمانت ہوتا تو پیشہ ورانہ رقابت کی اصطلاح ہی وجود میں نہ آتی - بہرحال اس نے ایک ڈاکٹر سے شادی کر لی - شروع شروع میں ان کی زندگی بہت اچھی گزری - دونوں پریکٹس کرتے تھے بہت آمدنی ہوتی تھی - لیکن رفتہ رفتہ ان کی زندگی تلخ ہونے لگی - میاں بیوی دونوں دن بھر کلینک میں رہتے - گھر نوکروں کے سپرد ہوتا - ان کا گھر (HOME) نہیں ہوٹل تھا - اور ہوٹل بھی ایسا جس کا کوئی منیجر نہ ہو - اس میں سب بیرے خانساماں ہوں - مرد کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ شام کو گھر آئے تو وہاں اسے (HOME) کا آرام اور سکون ملے - لیکن اس گھر میں وہ آرام اور سکون تو ایک طرف صحیح انتظام بھی نہیں ملتا تھا - اب ان میں بک بک جھک جھک شروع ہو گئی - کچھ عرصہ کے بعد ان کے ہاں دو تین بچے ہو گئے - اب ان کی دیکھ بھال ضروری ہو گئی - جب ماں کلینک جاتی تو بچے نوکروں کے سپرد ہوتے - ہمارے ہاں کے نوکر جس طرح بچوں کی تربیت کر سکتے ہیں - ظاہر ہے - اب ہر شام

میاں بیوی میں جھگڑا رہتا - بیوی شکایت کرتی کہ باپ بچوں کی تربیت کا کچھ خیال نہیں کرتا - باپ کہتا کہ میں روزی کماؤں یا بچوں کی تربیت کروں - یہ کام ماں کا ہے، باپ کا نہیں - دو سال کی تلخ کلامی کے بعد بالآخر بیوی کو کلینک چھوڑنا پڑا - کلینک چھوڑنے کو تو چھوڑ دیا لیکن یہ احساس اسے عمر بھر ستاتا رہے گا کہ اس سے بڑی زیادتی ہوئی ہے - اس سے اسے وہ اطمینان بھی نصیب نہ ہو سکا جو عام (HOUSE WIVES) کو ہوتا ہے - یہ ہے بلا سوچے سمجھے تعلیم دلانے کا نتیجہ - اس سے انفرادی زندگی ہی ناہموار نہیں ہوتی، قومی نقصان اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے -

میری سہیلی نے مجھے بتایا کہ اس کے (BATCH) کی قریب پچاس فی صد لڑکیوں کو ایسے ہی حالات میں پروفیشن چھوڑنا پڑا - ہمارے ہاں ایک تو ڈاکٹروں بالخصوص لیڈی ڈاکٹروں کی بہت کمی ہے پھر ایک لڑکے یا لڑکی کے ڈاکٹر بنانے پر قوم کا لاکھوں روپیہ صرف ہو جاتا ہے جب یہ لیڈی ڈاکٹرز اس طرح پروفیشن چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہیں تو قوم کی متاع بے بہا رائیگاں چلی جاتی ہے -

ہمارے ڈاکٹر دوسرے ملکوں میں چلے جاتے ہیں کیونکہ وہاں زیادہ مفاد حاصل ہوتے ہیں - اس طرح اپنا ملک ان کی خدمات سے محروم ہو جاتا ہے - ان باہر جانے والوں کا تو ہم رونا روتے ہیں - لیکن یہ جو ملک کے اندر رہتے ہوئے لیڈی ڈاکٹرز سے "ناہید کی امی" بن کر رہ جاتی ہیں اس قومی زیاں کی طرف کسی کی آنکھ نہیں اٹھتی -

اور یہ سب اس لئے کہ ہم مقصد کا تعین کئے بغیر بھیڑ چال اختیار رکئے ہوئے ہیں لیکن ہمارے ہاں ابھی تک قوم ہی کا مقصد اور نصب العین متعین نہیں ہوا - اس لئے تعلیم کے مقصد کے عدم تعین کی کیا شکایت! بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ ہم ابھی تک قوم ہی نہیں بن سکے - انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں - قرآن مجید کی روشنی میں قوم کا مقصد متعین کیجئے پھر دیکھئے کہ ہماری زندگی کا ہر گوشہ کس طرح بامقصد نہیں ہو جاتا - اے کاش! اپنی نمازوں میں "منہ طرف قبلہ شریف" کہنے والی قوم اپنی زندگی کے لئے بھی قبلے کا تعین کر لیتی - والسلام

۱۷- سلمیٰ پرویز

حضرتِ اکبر الہ آبادی سے معذرت کے ساتھ -

میرے بزرگو - اپنی جانی پہچانی بیٹی کا سلام لو -

ہم نے مروجہ نظام تعلیم کی خرابیوں پر بڑی گہری پُر از معلومات، نشترانہ تنقیدیں سنیں - میرے عزیز بھائیوں اور بہنوں کے ذاتی تجارب کی تلخ اور شیریں داستانیں بھی ہمارے سامنے آئیں - آپ کو شاید یاد ہو کہ اس قسم کی تنقید کی ابتدا اسی کونشن کے اسٹیج سے ایک مذاکرہ میں، میں نے ہی کی تھی - میں اس زمانے میں چھٹی یا ساتویں جماعت کی طالبہ تھی - میری وہی تنقید تھی جس سے طلوعِ اسلام کالج کے تصوّر نے جنم لیا تھا - میری عمر کے پیمانے کے اعتبار سے وہ بہت دور کی بات ہے - اس کے بعد میں نے اسکول

کی تعلیم مکمل کی۔ پھر کالج کی۔ پھر یونیورسٹی کی۔ اس لئے میں ان داستانوں میں مزید اضافے کر سکتی تھی، لیکن میں نے محسوس کیا کہ تصویر کا ایک اور رُخ بھی ہے جسے یہاں سامنے نہیں لایا گیا۔ شاید اس لئے کہ وہ تصویر نہیں بلکہ (NEGATIVE) ہے۔ لیکن جو کچھ بھی وہ ہے، میرے خیال میں اس کا سامنے لانا ضروری ہے اور میں اسی کی کوشش کروں گی۔

یہ شعر جو اس سال ہمارے مذاکرہ کا موضوع ہے مولانا اکبر الہ آبادی کا ہے۔ میرے دل میں مولانا مرحوم کا بڑا احترام ہے۔ ان کی زندگی بڑی پاکیزہ نظر آتی ہے۔ وہ جج تھے لیکن مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کی ذہنیت (TYPICAL) مُلّا کی تھی۔ وہ ذہنیت جس کی رُو سے ہر نئی چیز انسان کو جہنم میں دھکیل دینے کا موجب ہوتی ہے، خواہ وہ کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو۔ ان کی اس قدامت پرستی کی شہادت میں ان کے سینکڑوں اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن اس کے لئے نہ وقت ہے اور نہ ہی اس کا تعلق ہمارے موضوع سے ہے۔ اس لئے میں اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف ایک قطعہ پر اکتفا کرتی ہوں۔

اس زمانے میں ان کے شہر الہ آباد میں نیا نیا واٹر ورکس قائم ہوا تھا اور انگریزی کا اخبار پاؤنیر جاری۔ انہیں ان دونوں کے خلاف شکایت تھی۔ فرماتے ہیں۔

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے شاہ ایڈورڈ کی دُھائی ہے

اب جو شخص نلکے کا پانی اور ٹائپ کی چھپائی تک کے خلاف دُہائی مچا دے وہ زمانے کی دیگر جدتوں کو کس طرح گوارا کر لیتا؟

لیکن تماشائے روزگار ملاحظہ ہو کہ عین اسی زمانے میں سرسید پیدا ہوا جس کا مسلک یہ تھا کہ دنیا میں جہاں بھی کوئی منفعت بخش اور کارآمد چیز دریافت ہو مسلمانوں کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر اس نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ جس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی ظاہر ہے کہ مولانا اکبر کی طرف سے اس کی مخالفت لازمی تھی۔ اگر بغور دیکھا جائے تو سرسید اور اکبر دو شخصیتیں نہیں بلکہ دو تحریکیں نظر آئیں گی جو ایک دوسرے سے متضاد سمتوں میں چلتی ہیں۔ وہی قدامت اور جدت کی کشمکش جو روزِ ازل سے جاری ہے۔ مولانا اکبر کا یہ شعر جو ہمارے مذاکرہ کا موضوع ہے مغربی نظامِ تعلیم کے خلاف تنقید نہیں تھا۔ یہ سرسید کی تحریک کی مخالفت تھی جس کا مظہر علی گڑھ کالج تھا۔ یہ تو غنیمت ہوا کہ اکبر چونکہ مزاحیہ انداز میں تنقید کرتا تھا اس لئے لوگوں نے ان کی مخالفت کو سنجیدگی سے (SERIOUSLY) نہ لیا۔ ورنہ ایک طرف ہمارے علماء کرام کا فتوےٰ کہ انگریزی پڑھنا حرام ہے اور اس کے ساتھ اکبر جیسے شاعر کی مخالفت، سرسید کی تحریک کے ناکام رہ جانے میں کوئی کسر نہ رہتی۔ اور اگر وہ تحریک ناکام رہ جاتی تو میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتی کہ آج نہ دنیا کے نقشے میں کہیں پاکستان کا وجود نظر آتا اور نہ ہی ہمارا جداگانہ ملی تشخص! ہمیں ہندو کبھی کا ہڑپ کر چکا ہوتا۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ میں مغربی نظامِ تعلیم کی تائید کر رہی ہوں۔ میں اُسے جڑ سے اکھیڑ کر اس کی

جگہ اس نظامِ تعلیم کے رائج کرنے کو اپنی زندگی کا مشن سمجھتی ہوں جس کا داعی طلوع اسلام ہے لیکن مختلف حالات کے مختلف تقاضے ہوتے ہیں۔ جب سرسید نے انگریزی تعلیم کو رائج کیا تو اس وقت کے حالات کا یہی تقاضا تھا۔ آج کے حالات کا تقاضا وہی ہے جس کے لئے ہم کوشش کر رہے ہیں۔

اکبر نے جو کہا ہے کہ :- افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی ——— تو اس سے تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسانیت اسکولوں اور کالجوں میں ذبح ہوتی ہے۔ مکتبوں اور دارالعلوموں میں وہ بڑھتی، پھولتی پھلتی اور پروان چڑھتی ہے۔ یہ غلط ہے۔ قوم دونوں قتل گاہوں میں ذبح ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک جگہ وہ مشینوں سے ذبح ہوتی ہے اور دوسری جگہ بسم اللہ، اللہ اکبر پڑھ کر چھری سے۔

جانوروں کی صورت میں تو ان دونوں ذبیحوں میں فرق ہو سکتا ہے لیکن انسانوں کی صورت میں ان میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ انسانیت کا جس قدر خون مذہبی مقتلوں میں بہایا گیا ہے مشینی ذبح خانوں میں اس کا ہزارواں حصہ بھی نہیں آیا۔ میں اس مختصر سے وقت میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ہماری مذہبی درس گاہوں میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں کے فارغ التحصیل طالب علم جنہیں علماء کہہ کر پکارا جاتا ہے کس سیرت و کردار کے حامل ہوتے ہیں چونکہ یہ مسئلہ بڑا نازک ہے۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اس باب میں ایک لفظ بھی اپنی طرف سے نہ کہوں۔ خود انہی حضرات کے ممتاز نمائندوں کے خیالات پیش خدمت کروں۔ امید ہے آپ میری اس کوشش کو مفید پائیں گے۔ پہلے تعلیم کو لیجئے۔

جس نصاب کی تکمیل کے بعد ہمارے دارالعلوموں کے طالب علم، علماءِ دین قرار دے دئے جاتے ہیں اسے درس نظامی کہا جاتا ہے اس کے متعلق مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں :-

"اس نصاب کی چند کتابیں الٹی سیدھی پڑھ کر ہر شخص اپنے آپ کو دین کا مختارِ کل سمجھنے لگ جاتا ہے حالانکہ ان کتابوں میں دین کا حصہ اس سے زیادہ نہیں ہوتا جتنا آٹے میں نمک۔" (ترجمان القرآن نومبر ۱۹۵۱ء)

"جو لوگ اس نظامِ تعلیم کے تحت پڑھ رہے ہیں اور اس سے تربیت پا کر نکل رہے ہیں ان کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ ہماری مسجدوں کو سنبھال کر بیٹھ جائیں یا کچھ مدرسے کھول لیں اور طرح طرح کے مذہبی جھگڑے چھیڑتے رہیں تاکہ ان جھگڑوں کی وجہ سے قوم کو ان کی ضرورت محسوس ہو۔" (تعلیمات ۱۳۹-۱۳۸)

آگے چل کر ارشاد ہے :-

"ان درس گاہوں کے فارغ التحصیل طلبا نہ تو اسلام کی صحیح نمائندگی کر سکتے ہیں اور نہ ہی موجودہ زندگی کے مسائل پر اسلام کے اصولوں کو منطبق کر سکتے۔ نہ ان کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ دینی اصولوں پر قوم کی راہ نمائی کر سکیں اور نہ ہی وہ ہمارے اجتماعی مسائل میں سے کسی مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ان کی بدولت دین کی عزت میں اضافہ ہونے کے بجائے الٹی اس میں کمی ہو رہی ہے۔

.... پھر ان کی بدولت ہمارے ہاں مذہبی جھگڑوں کا ایک سلسلہ ہے جو کسی طرح ٹوٹنے میں نہیں آتا کیونکہ ان کی ضروریات زندگی انہیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان جھگڑوں کو تازہ رکھیں اور بڑھاتے رہیں۔ یہ جھگڑے نہ ہوں تو قوم کو ان سے ان کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔" (تعلیمات ۱۳۹-۴۰)

آپ نے غور فرمایا کہ دین کے نام سے جس تعلیم کے حاصل کرنے پر یہ حضرات اپنی عمریں صرف کر دیتے ہیں ۔ اس کا ما حصل کیا ہوتا ہے ؟

فرمائیے کہ اس سے ایسا ئے قوم ذبح ہوتے ہیں یا حیاتِ تازہ حاصل کرتے ؟ ان علماء کا فریضہ یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ مذہب گزیدہ نوجوانوں کو از سرِ نو اسلام کا گرویدہ بنائیں ۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب فرماتے ہیں ۔

"اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کو بیان کرنے کا جو طریقہ آج ہمارے علماء اختیار کر رہے ہیں وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنے کے بجائے اُلٹا متنفر کر دیتا ہے اور بسا اوقات ان کے مواعظ سن کر یا ان کی تحریروں کو پڑھ کر بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا کرے کسی غیر مسلم یا بھٹکے ہوئے مسلمان کے چشم و گوش تک یہ صدائے بے ہنگام نہ پہنچی ہو" (تفہیمات صفحہ ۲۰)

سن لیا آپ نے ؟ اب آگے بڑھیئے ۔

جس طرح یونیورسٹیوں کے طالب علم یہاں سے ایم ، اے کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لئے یورپ یا امریکہ جاتے ہیں ۔ اسی طرح ہمارے ان دار العلوموں کے فارغ التحصیل طالب علم یعنی علما حضرات ، مزید تعلیم کے لئے بالعموم مصر کی ازہر یونیورسٹی میں داخلہ لیتے ہیں ۔ جامعہ ازہر قریب ایک ہزار سال سے قائم چلی آرہی ہے اور دنیا میں دینی علوم کی سب سے اعلیٰ درسگاہ قرار دی جاتی ہے ۔ اس درسگاہ کے متعلق خود مصر کے ایک عظیم عالم ، مفتی محمد عبدہٗ جو بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر لکھتے ہیں کہ :-

"جو شخص ازہر یا اسی قبیل کے مدارس میں جتنی زیادہ مدت تک تحصیل علم کرتا ہے اتنی ہی اس میں تحصیلِ علم کی صلاحیت مفقود ہوتی جاتی ہے" (تفسیر اعتاد - بحوالہ طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۵۸ء)

ان علماء کی تحصیلِ علم کی صلاحیت ہی مفقود نہیں ہوتی ۔ مفتی عبدہٗ فرماتے ہیں کہ "علمائے ازہر" اور ان کی قسم کے اور بڑے بڑے مشیوخ و علماء وہ لوگ ہیں جن کی اصلاح کی امید باقی نہیں رہی (ایضاً)

یہ ہے ان مذہبی درسگاہوں کی تعلیم کا منتہیٰ ! یعنی ان کے سند یافتہ حضرات میں نہ تحصیلِ علم کی صلاحیت باقی رہتی ہے اور نہ ہی ان کی اصلاح ہو سکتی ہے ۔ ناقابلِ اصلاح جہالت ، یہ ہے ان کے علم کا کمال ۔

مولانا اکبر آج زندہ ہوتے تو میں ان کی خدمت میں عرض کرتا کہ آپ نے جہاں فرعون کے مذبح خانوں کو دیکھا تھا وہاں ہامان کی قتل گاہوں پر بھی ایک نظر ڈال لیتے تو تصویر کے دونوں رخ آپ کے سامنے آجاتے ۔

ہماری مذہبی درسگاہوں میں جس قسم کی تعلیم ملتی ہے اس کی ایک جھلک آپ نے دیکھ لی ۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ ان میں قوم کے نوجوانوں کی جس ... کی تربیت ہوتی ہے اس سے ان میں کس کیرکٹر کس قسم کا پیدا ہوتا ہے کہ علم سے کہیں بڑھ کر اہمیت ، سیرت و کردار کو حاصل ہوتی ہے اور مولانا اکبر نے بھی جب بچوں کے قتل کا ذکر کیا ہے تو اس سے ان کی حقیقی مراد سیرت و کردار ہی کی پستی ہے ۔ آئیے ہم دیکھیں کہ طبقہ علماء کے نمائندگان ان کی سیرت و کردار کا نقشہ کس قسم کا پیش کرتے ہیں ۔

مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں :-

آپ ذرا چراغ لے کر وہ مقدس چہرے ڈھونڈ کر دکھا دیجئے جو طلبا کو دین کے اسرار سے آگاہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ کیا کوئی ایک ادارہ بھی ایسا ہے جس میں اسلامی نظامِ زندگی کی تعلیم و تربیت دینے کا انتظام کیا گیا ہو۔

جس ملک میں اسلامی نظام نافذ ہونے والا ہے۔ اس میں یہ ذہنوں کی پستی۔ طبائع کا افلاس اور ہمت کی کمزوری کا روشن ثبوت ہے کہ آج بھی ہمارے آئمۂ مساجد دعوت دیتے ہیں کہ آؤ! تعلیم دین خطرے میں ہے۔ ہمارے مدرسے کی مدد کرو اور پھر بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ ہمیں اتنا چندہ ملا۔ کیا اس ملک میں قرآن کا نظام قائم ہوگا جس میں آج تک ہمارے ناظمین مدارس دینیات کو اس سے نجات نہ مل سکی کہ وہ دربدر پھر کر تعلیم دین کے لئے چندہ جمع کریں (بحوالہ طلوعِ اسلام بابت مئی سنہ ۱۹۶۹ء) مودودی صاحب کی غالباً تلقین یہ ہے کہ انہیں چاہیئے کہ دربدر چندہ جمع کرنے کے بجائے جماعت اسلامی کی طرح سال میں ایک ہی بار قربانی کی کھالیں اکھٹی کر لیا کریں۔

تقسیم ہند سے پہلے کی تحریکوں پر تنقید کرتے ہوئے مودودی صاحب، علماء کے متعلق لکھتے ہیں:-

"کہیں جُبّوں اور عماموں میں سیاہ دل اور گندے اخلاق پلٹے ہوتے ہیں۔ زبان سے وعظ اور عمل میں بدکاریاں۔ ظاہر میں خدمتِ دین اور باطن میں خیانتیں اور غداریاں اور نفسانی اغراض کی بندگیاں۔ جمہور مسلمان بڑی بڑی امیدیں لے کر ہر نئی تحریک کی طرف دوڑتے ہیں مگر مقاصد کی پستیاں اور عمل کی خرابیاں دیکھ کر ان کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔" (تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان صفحہ ۱۰۳)

ضمناً۔ مودودی صاحب نے یہاں علماء حضرات کی پستیٔ کردار کی ایک مثال یہ دی ہے کہ وہ زبان سے کہتے کچھ اور ہیں لیکن کرتے کچھ اور۔ میں اپنے اس مقالہ میں ذاتیات کو درمیان میں نہیں لانا چاہتی تھی لیکن مودودی صاحب کے اس وعظ سے میرے سامنے خود مودودی صاحب کا ایک ایسا واقعہ آگیا جس کا تعلق ہمارے موضوع سے ہے اس لئے اس کا ذکر ناگزیر ہوگیا۔ اسے حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے اپنے ہفتہ وار اخبار المنبر کی ۱۲ راکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں بیان کیا تھا۔ واضح رہے کہ حکیم اشرف صاحب کسی زمانے میں مودودی صاحب کے مقربین میں سے تھے پھر اس تحریک سے الگ ہوگئے۔

انہوں نے لکھا تھا کہ:-

"سنہ ۱۹۵۶ء کی مجلس شوریٰ میں متعدد ارکانِ جماعت کی جانب سے یہ الزام مولانا مودودی پر لگایا گیا تھا کہ مولانا نے تحریک اسلامی کے محرکِ اوّل اور جماعت اسلامی کے بانی و امیر کی حیثیت سے یہ تصور پیش کیا تھا کہ موجودہ تعلیم گاہیں، قتل گاہیں ہیں۔ اس لئے ان میں اپنے بچوں کو داخل کرنا، انہیں قتل کر دینے کے مترادف ہے۔ چنانچہ مولانا کی اس زوردار تنقید سے متاثر ہوکر جماعت اسلامی کے متعدد کارکنوں اور ارکان نے اپنی اولاد کو مروجہ تعلیم سے محروم رکھا۔ اور ان میں بعض ایسے افراد بھی تھے جن کی اولاد کا اس تعلیم سے محروم رہ جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی اولاد کو اپنی برادری میں "نکو" بنا دیں اور ان کے رشتوں ناطوں تک کا معاملہ مخدوش ہو کر رہ جائے۔ لیکن تعجب ہے کہ اس تنقید اور مسلمانوں کو

موجودہ تعلیم گاہوں سے اپنی اولادوں کو اٹھا لینے کی دعوت کے بعد خود امیر جماعت نے اپنے لڑکوں کو انہی کالجوں میں داخل کرایا۔ یہی اقدام ناقابلِ تصور تھا۔ مگر جب ارکانِ جماعت نے یہ سنا کہ مولانا مودودی صاحب نے اپنی بچیوں کو بھی کالجوں میں داخل کرایا ہے تو ارکانِ جماعت کی مایوسی کی انتہا نہ رہی کہ اگر خود داعی ہی اپنی دعوت کے پرخچے اڑانے لگے تو اس کی حفاظت کون کرے گا۔

جب یہ سوال مرکزی شوریٰ کے زیرِ بحث آیا اور ارکانِ شوریٰ اس پر اظہارِ رائے کر چکے، تو مولانا مودودی صاحب نے اس الزام کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ "میرے سامنے دو راستے تھے۔ ایک ظالم باپ بننے اور داعی کی حیثیت سے اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کا۔ اگر میں اپنی اولاد کو تعلیم سے محروم رکھتا تو خود میری اولاد مجھے "ظالم باپ" کہتی۔ اس صورت میں، میں بعض لوگوں کے تصور کے مطابق داعی کی حیثیت سے اپنی بات پر عمل پیرا تو ہو جاتا مگر ظالم باپ ضرور بنتا اور اپنی اولاد کو پست معیار اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا۔"

دوسرا راستہ یہ تھا کہ "میں اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتا۔ اور جہاں تک بس چلتا۔ اس کی اخلاقی تربیت کا اہتمام کرتا۔ سو میں نے اسی کو ترجیح دی۔"

یہ ہے اس کردار کی ایک جھلک جو ہمارے علماء حضرات ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ بہرحال اب آگے چلئے۔ مودودی صاحب نے علماء کے جس کردار کا نقشہ پیش کیا ہے اس کا تعلق صرف ہندوستان کے علماء سے نہیں۔ ساری دنیا کے علماء کی یہی حالت ہے۔

روس کے ایک جید عالم موسیٰ جار اللہ (مرحوم) نے ایک دفعہ مودودی صاحب کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں ہندوستان کے علماء کی پستیٔ کردار کی شکایت کی گئی تھی۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے اپنے رسالہ میں لکھا کہ:-

"ان جرائم کے مجرم تنہا ہندوستان ہی کے علماء نہیں ہیں بلکہ اس باب میں تمام عالم اسلامی کے علماء کا حال یکساں ہے۔ ہر جگہ کے مدارس میں قرآن متروک و مہجور ہے۔ ہر جگہ اس گروہ میں انانیت، کبر، خود پرستی کی وہی بیماریاں ہیں جو علامہ کو یہاں کے علماء میں نظر آ رہی ہیں۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ کے علماء اپنے انجام کو پہنچ گئے ہیں اور قدرت کی طرف سے ان جرائم کی جو سزا مقرر تھی وہ ان کو مل چکی ہے۔"

(ترجمان القرآن بابت جنوری فروری ۱۹۴۵ء)

یہ تو مودودی صاحب نے فرمایا تھا اور میں اس پر یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ بعض کو یہ سزا مل چکی ہے اور باقیوں کو ملا چاہتی ہے! وہ ذرا انتظار فرمائیں۔ فطرت کی تعزیر کسی کو بھی نہیں چھوڑا کرتی۔

ان حضرات کا اپنے طبقہ سے باہر یعنی غیر مولویوں کے ساتھ جو برتاؤ ہے اسے چھوڑیئے۔ خود اپنے حلقہ کے اندر ایک دوسرے کے خلاف ان کی جو کیفیت ہے اس کی ایک جھلک بھی مودودی صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ کسی صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ جمعہ کے خطبے عوامی زبان کے بجائے عام فہم اردو زبان میں ہونے چاہئیں۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے لکھا کہ یہ تجویز بڑی خطرناک ہے۔

"اگر آپ نے ان حضرات کو عام فہم زبان میں من مانے خطبے دینے کا موقع دیا تو یقین جانئے کہ آئندہ دن مسجدوں میں سر پھٹول ہوگی - اس لئے کہ ان میں کا ہر شخص اپنا اپنا مشرب رکھتا ہے اور اپنے مشرب میں وہ اتنا سخت ہے کہ دوسرے مشرب والوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا اس کے نزدیک گناہ سے کم نہیں پھر اللہ نے اس کی زبان میں ایک ڈنک رکھ دیا ہے جس سے دلوں کو زخمی کئے بغیر وہ کوئی بات نہیں کر سکتا۔" (طلوع اسلام بابت اپریل ۱۹۵۳ء)

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ دوسروں کی زبان کے ڈنک دکھانے والے مودودی صاحب خود اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ :-

"اب تک میں نے کوئی چیز ایسی نہیں لکھی جس پر کسی نہ کسی گروہ کو چوٹ نہ لگی ہو اور اگر میں یہ فیصلہ کر لوں کہ کوئی ایسی چیز نہ لکھی جائے جو مسلمانوں کے کسی گروہ کو ناگوار نہ ہو تو شاید کچھ بھی نہ لکھ سکوں۔"

(رسائل و مسائل حصہ اوّل صفحہ ۲۸۳)

مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کو طبقۂ علماء میں جو مقام حاصل تھا اس سے سب واقف ہیں - انہیں امام الہند کہہ کر پکارا جاتا تھا - آخر میں علماء کے متعلق ان کی رائے بھی سن لیجئے جسے میں انتہائی مذمت کے ساتھ بادلِ ناخواستہ پیش کرنے کی جرأت کرتی ہوں - وہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب "تذکرہ" میں لکھتے ہیں "سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے لیکن علمائے دنیا پرست کبھی یک جا اکٹھے نہ ہوں گے - کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور اُدھر ان کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے - یہی حال ان سگانِ دنیا کا ہے - یہ ساری باتوں میں متفق ہو سکتے ہیں لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑ رہی ہو وہاں پہنچ کر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔"

فساق و فجار، خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کا جام تندرستی پیتے ہیں اور چور اور ڈاکو مل جل کر راہ زنی کرتے ہیں - مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد و عبادت کے صومعہ اور خانقاہ میں بیٹھ کر بھی متحد و یک دل نہیں ہو سکتا اور ہمیشہ ایک دوسرے کو مرتدوں کی طرح چیرتا پھاڑتا اور پنجے مارتا ہے -

میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار و الفت کی باتیں سننے میں آجاتی ہیں مگر عین محراب مسجد کے نیچے پیشوائے امامت کے لئے ان میں ہر ایک کا ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا، اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوئی ہے - حضرت مسیح نے احبارِ یہود سے فرمایا تھا کہ :-

"تم نے داؤد کے گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنا دیا ہے -

ڈاکوؤں کے بھٹ کا حال تو معلوم نہیں لیکن ہم نے مسجد کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غراتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے۔" (تذکرہ صفحہ ۸۹ - ۸۳)

مولانا آزاد نے جس حقیقت کا اظہار تند و تیز لہجہ اور سخت اور کرخت زبان میں کیا ہے - علامہ اقبال نے اسے بال و پر جبرئیل کی سی نرمی اور نزاکت سے پیش کیا ہے - وہ اپنی مشہور نظم جس کا عنوان ہے "ملا اور بہشت" میں کہتے ہیں :-

میں بھی حاضر تھا وہاں، ضبطِ سخن کر نہ سکا ۔۔۔ حق سے جب حضرتِ ملّا کو ملا حکمِ بہشت
عرض کی میں نے الٰہی! مری تقصیر معاف ۔۔۔ خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول ۔۔۔ بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا ۔۔۔ اور جنت میں نہ مسجد، نہ کلیسا، نہ کنشت

یہ ہے میرے بزرگو اس کردار اور اخلاق کا نمونہ، جو ہمارے مذہبی دارالعلوموں کی تربیت کا ماحصل ہوتا ہے۔ کیا اس کے بعد آپ کہہ سکتے ہیں کہ قوم کے بچوں کا قتل صرف اسکولوں اور کالجوں میں ہوتا ہے مکتبوں اور دارالعلوموں میں نہیں ہوتا۔ اگر آج مولانا اکبر زندہ ہوتے تو ہم اُن سے بصد ادب کہتے کہ یوں فرمائیے کہ:

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی ۔۔۔ اس دور کے ملّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

سو، سوال مشرقی تعلیم اور مغربی تعلیم کا نہیں۔ ان دونوں سے قوم کے بچے ذبح ہوتے ہیں اور بُری طرح ذبح۔ اس کا علاج صرف وہ ہے جسے طلوعِ اسلام کی درس گاہ کا تصور پیش کرتا ہے۔

یعنی دنیاوی علوم قرآنی اقدار کی روشنی میں اس طرح پڑھائے جائیں کہ طلبا کی نگاہوں میں غلط اور صحیح میں امتیاز کرنے کی صلاحیت اور ان کے دلوں میں غلط کو چھوڑ کر صحیح کو اختیار کرنے کی آرزو بیدار ہو جائے۔ اس سے قوم کے بچے حیاتِ تازہ حاصل کر کے صفِ انسانیت میں کھڑے ہونے کے قابل بن سکیں گے۔

قرآنی کالج کا جواب صحرائے سینا کی تربیت گاہ ہے، بابائی بت کدہ نہیں۔ والسلام

---

۱؎ حضرت اکبر الہ آبادی نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں خود ہی اپنے سابقہ خیالات سے رجوع فرما لیا تھا۔ ان کے اور سرسید کے مشترکہ دوست عبدالغفور نساخ (مرحوم) کے صاحبزادہ جناب شمس فرید پوری نے اکبر سے دریافت فرمایا۔ "آپ پہلے سرسید کے سخت مخالف تھے لیکن بعد میں ان کی تعریف کرنے لگے۔ آپ کے خیالات میں تبدیلی کیسے آئی؟" اکبر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"جس طرح اور لوگوں نے سرسید کو سمجھنے میں غلطی کی تھی اسی طرح مجھے بھی ان کو سمجھنے میں مغالطہ ہوا تھا۔ جب میں علی گڑھ گیا۔ ان کے کاموں کو قریب سے دیکھا۔ ان کی محنت۔ ان کا خلوص۔ ان کا ایثار دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ مجھے بہت پشیمانی ہوئی کہ جس قوم کو سرسید جیسا مخلص راہنما نصیب ہو اس کی کامیابی میں شک کرنا کفر ہے۔"

(علامہ رضا علی وحشت (مرحوم) کا مقالہ۔ "اکبر الہ آبادی اور بنگال" شائع شدہ "نگار پاکستان" کراچی۔ اکبر الہ آبادی نمبر ستمبر ۱۹۶۹ء۔ بحوالہ سہ ماہی القلم (کراچی) جولائی تا ستمبر ۱۹۷۴ء صفحہ ۱۷)

---

## معذرت

سابقہ اشاعت میں کہا گیا تھا کہ اشاعت رواں میں "فرقہ اہل قرآن" سے متعلق ایک مبسوط مقالہ شائع کیا جائے گا۔ ہمیں افسوس ہے کہ عدم گنجائش کی وجہ سے وہ مقالہ حالیہ اشاعت میں بار نہیں پا سکا۔ اسے آئندہ شائع کیا جائے گا۔ (مدیر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اَجَلاً مُّسَمًّی

(ڈاکٹر سید عبدالودود)

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّی وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔ (۴۰/۶۷)

"اس نے تمہاری تخلیق کی ابتدا بے جان مادہ سے کی (پھر زندگی کو مختلف مراحل سے گزارتے ہوئے اسے اس مقام پر لے آیا) جہاں پیدائش نطفہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ پھر اس نطفہ کو (رحم مادر میں) ایک لٹکتی ہوئی شے (Blasto cyst.) بنایا۔ پھر تم انسانی بچے کی شکل میں دنیا میں آئے۔ پھر تم جوانی کی عمر کو پہنچتے ہو۔ پھر بوڑھے ہو جاتے ہو۔ پھر تم میں سے بعض جلدی وفات پا جاتے ہیں اور بعض مقررہ مدت (Life Span.) تک پہنچ جاتے ہیں۔ (ہم نے یہ حقائق اس لئے بیان کئے ہیں کہ) تم ان پر غور و فکر کرو۔"

حقیقت مندرجہ بالا آیت کے ایک ایک لفظ پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ خلقکم من تراب کے الفاظ میں زندگی کی نمود سے پیشتر کرۂ ارض کے ابتدائی تین ارب سال میں بے جان مادہ کی ارتقائی منازل کا راز پنہاں ہے۔ پھر اسی طرح ثم من نطفۃ میں اس ارتقائی مرحلے کا ذکر ہے جب ہر نئی زندگی کی ابتدا (Reproductive Units.) کے ذریعے شروع ہوئی۔ اس کے بعد انسانی بچے کی پیدائش پھر جوانی اور پھر بڑھاپے کا ذکر ہے۔ ان تمام امور کو میں موجودہ دور کے سائنسی انکشافات کی رو سے اپنی کتاب (Phenomena of Nature & the Quran.) میں تفصیلاً بیان کر چکا ہوں۔ اس وقت زیر بحث اصطلاح اَجَلاً مُّسَمًّی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ بعض لوگ جلدی مر جاتے ہیں اور بعض اجلاً مسمیٰ تک پہنچ جاتے ہیں۔ "اجل" کے لفظی معنی ایک مقررہ مدت کے ہیں اور یہ لفظ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً:

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸)۔ ہر اجل کے لئے ایک قانون مقرر ہے۔

وما كان لنفس ان تموت الا باذن الله كتابا مؤجلا (۳/۱۴۵) کوئی ذی حیات خدا کے مقرر کردہ قانونِ اجل کے بغیر نہیں مرتا۔

وما یعمر من معمر ولا ینقص من عمرہٖ الا فی کتاب (۳۵/۱۱)۔ نہ کسی بڑی عمر والے کو عمر زیادہ دی جاتی ہے اور نہ ہی اس کی عمر کم کی جاتی ہے بلکہ سب کچھ ایک قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں" قابلِ غور بات یہ ہے کہ وہ قانونِ اجل کیا ہے جس کے مطابق انسانی عمر بڑھتی گھٹتی ہے اور پھر اجلاً مسمیٰ کیا ہے؟

علمِ حیاتیات (Biology) کا وہ مسئلہ ہے جس پر موجودہ دور سے پہلے کبھی غور نہیں کیا گیا۔ اور ہمیشہ یہ سمجھا گیا کہ اس مسئلہ پر سوچنا لاحاصل ہے لیکن گذشتہ چند سالوں سے سائنسدانوں نے اس موضوع پر بڑی جانفشانی سے تحقیق کی ہے کئی برسوں سے (Lay Press یعنی اشاعت کے وہ ذرائع جنہیں غیر سائنس دان کنٹرول کرتے ہیں) نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے اور کہا گیا ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں لوگوں کی عمریں اب پہلے سے بہت لمبی ہوگئی ہیں۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ انسانی زندگی کی مدت مقرر شدہ ہے اس کے کیا معنی ہیں؟ عام طور پر عمر لمبی ہونے کا مطلب ایک فرد کی مدتِ عمر کا لمبا ہونا لیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے اور وضاحت طلب۔

انسان کی موت دو مختلف وجوہات سے واقع ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک حادثاتی ہے اور دوسری طبعی۔ اول الذکر میں مختلف قسم کی بیماریاں، حادثات اور ماحول کے اثرات کارفرما ہوتے ہیں۔ انسان کی پیدائش کے بعد اوائل عمر میں بے شمار موتیں ہوتی ہیں جب ننھی جان بہت سی بیماریوں کی زد میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد بچپن میں بھی موتوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ ازاں بعد حادثات، موسمی اثرات، زیادہ گرمی، زیادہ سردی، متعدی امراض و دیگر کئی قسم کے امراض سے موتیں واقع ہوتی ہیں۔ پھر بعض انسان (Predators۔ یعنی انسان سے زیادہ طاقتور درندوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مندرجہ بالا موتوں کو علاج معالجہ اور حفظ ما تقدم کے ذریعے روکا جا سکتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ انسانی موت کے وقت کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آج سے تیس چالیس برس پیشتر ہیضہ، پلیگ، ٹائیفائیڈ، چیچک وغیرہ اچھوت کی بیماریوں سے بے شمار انسان لقمۂ اجل بنتے تھے۔ لیکن اب قریب قریب ان تمام بیماریوں پر قابو پا لیا گیا ہے۔ اب ان امراض سے شاذ و نادر ہی اموات واقع ہوتی ہیں۔ اللہ کا مقرر کردہ قانون یہ ہے کہ جب بھی مندرجہ بالا قسم کے امراض کے جراثیم انسانی جسم میں داخل ہوں گے تو انسان کی قوتِ مدافعت اور ان جراثیم میں باہمی کشمکش ہوگی۔ اگر قوتِ مدافعت غالب آ گئی تو انسان زندہ رہ جائیگا اور اگر جراثیم غالب آ گئے تو انسان مر جائیگا۔ انسان کی قوتِ مدافعت ادویات اور دیگر ذرائع سے بڑھائی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کا خون حادثہ کی وجہ سے ضائع ہو جائے تو دوسرے انسان کا خون اس کے جسم میں منتقل کر کے اس کو موت سے بچایا جا سکتا ہے۔ گویا میڈیکل پروفیشن کی تمام تگ و دو اس لئے ہوتی ہے کہ انسانوں کو موت سے بچایا جائے۔ بالفاظ دیگر، انسانی موت کے وقت پر یہ قانون اثر انداز ہوتا ہے کہ انسان نے بیماریوں اور حادثات کو روکنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کیں۔ موجودہ زمانے کی مہذب دنیا میں جن بیماریوں سے زیادہ اموات واقع ہوتی ہیں وہ ہیں سرطان اور دل یا دورانِ خون کی

بیماریاں ۔ دل اور دورانِ خون کی بیماریاں ورزش کی کمی، چکنی غذا کی زیادتی، تمباکو نوشی، زیادہ تفکرات وغیرہ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ جن پر حفظ ماتقدم سے بڑی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔ لیکن سرطان کے مرض کے لئے تاحال کوئی حفظ ماتقدم کی صورت پیدا نہیں ہو سکی لیکن اگر بالفرض سرطان پر پوری طرح قابو پا لیا جائے تو انسانی آبادی کی ۲ فیصد کی زندگی کو اور بڑھایا جا سکتا ہے۔ اور اگر ہم دل کی بیماریوں، خون کا دباؤ اور فالج وغیرہ پر پوری طرح قابو پالیں تو انسانی آبادی کی سات فیصد کی زندگی اور لمبی ہو سکتی ہے۔ گویا حادثات اور بیماریوں پر کنٹرول کی وجہ سے انسانی آبادی کے ایک مخصوص حصے کے موت کے وقت کو کچھ مدت کے لئے ٹالا جا سکتا ہے لیکن ان تدابیر کا بنی نوع انسان کی (Life Span) جبلّی عمر پر اثر نہیں پڑتا۔ ذی حیات اشیاء کی ہر نوع کے لئے اللہ تعالیٰ نے زندگی کی ایک میعاد مقرر کر دی ہے (نوع کا لفظ پیشِ نظر رکھیے)۔ مثلاً مکھی کی (Life Span) چالیس دن ہے۔ گویا اگر حادثاتی موت نہ ہو تو یہ چالیس روز کے بعد خود بخود مر جائے گی۔ اسی طرح چوہا تین سال کے بعد خود بخود مر جائے گا۔ گھوڑا تیس سال کی عمر کے بعد ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک انسان تقریباً یکصد سال کے بعد اپنی طبعی موت مر جائے گا۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل نقشہ ملاحظہ ہو۔

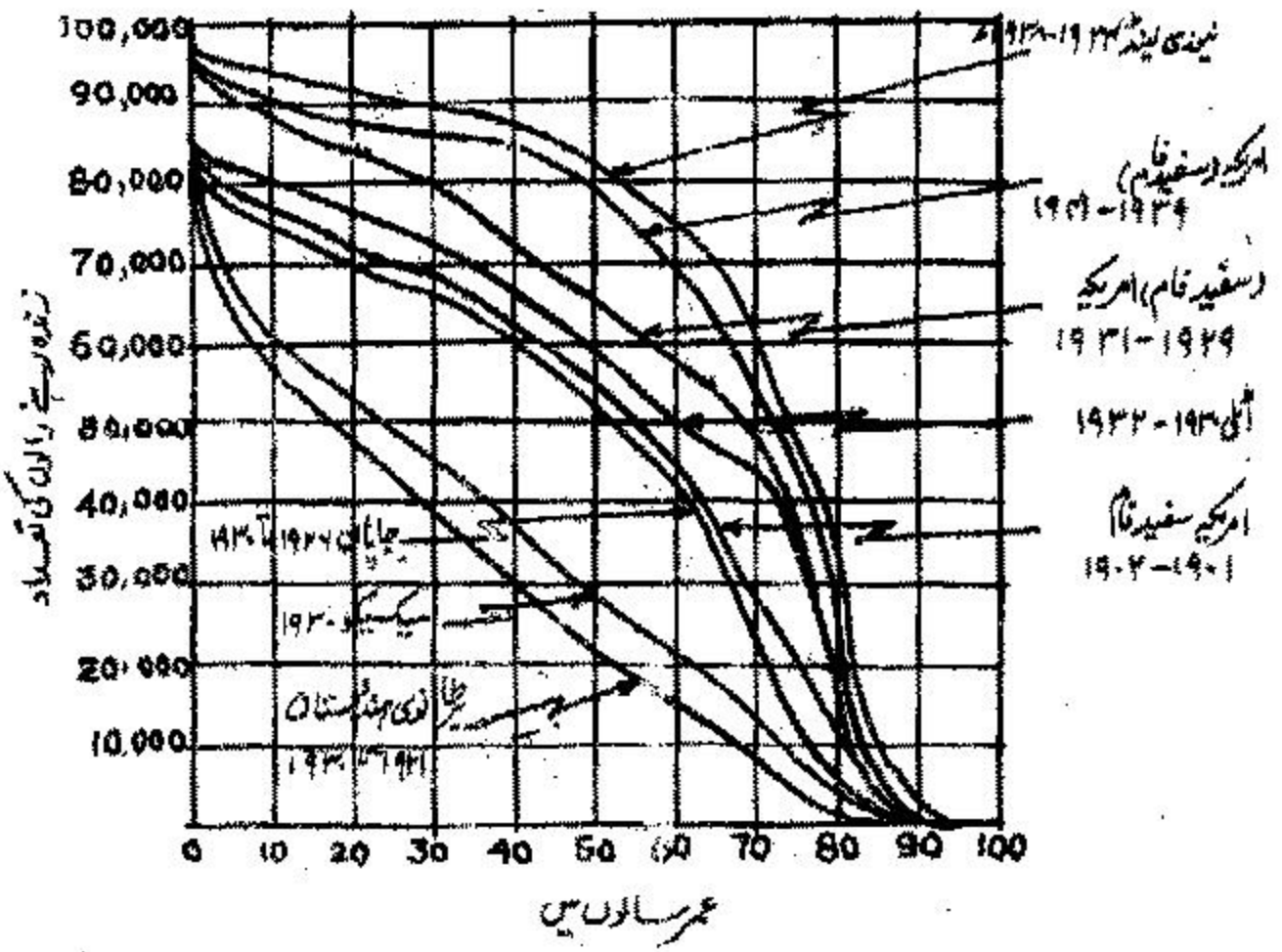




مندرجہ بالا نقشے میں دنیا کے مختلف ممالک کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ایک لاکھ آدمی مندرجہ ذیل سالوں میں

فلاں فلاں ملک میں کتنی مدت زندہ رہے۔ مثلاً برٹش انڈیا میں ۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۱ء ۔ ۴۰ سال کی عمر میں ایک لاکھ میں سے ۳۵۰۰۰ زندہ رہے، باقی مرگئے۔ اسی طرح امریکہ کی سفید فام آبادی میں چالیس سال کی عمر میں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۲ء تک ایک لاکھ میں سے ساٹھ ہزار بچ رہے باقی مرگئے۔ پھر امریکہ میں ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۱ء میں، ۴۰ سال کی عمر میں ۸۰۰۰۰ باقی رہے باقی ۲۰۰۰۰ مرگئے۔ نیوزی لینڈ (۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۳ء میں)۔ ۴۰ سال کی عمر میں ۸۵۰۰۰ زندہ رہے باقی مرگئے۔

یہ مختلف ممالک میں زندگی کی لمبائی میں فرق اسلئے ہے کہ بعض ممالک نے بیماریوں اور حادثات پر دوسرے ممالک کی نسبت سے زیادہ قابو پا لیا لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ اعداد و شمار میں اتنے فرق کے باوجود ہر ملک کے سو فیصد انسان ۹۰ یا ۹۵ سال کی عمر میں مرگئے۔

اب دوبارہ آیت قرآنی (۲۲/۵) کیطرف لوٹیے۔ پھر تم میں سے بعض جلدی وفات پا جاتے ہیں اور بعض ولتبلغوا اجلاً مسمیٰ یعنی (اجل) مقررہ مدت تک پہنچ جاتے ہیں۔ گویا نوع انسان کی اجلاً مسمیٰ ۹۰ یا ۹۵ سال کے قریب ہے۔ انفرادی حیثیت کا سوال الگ ہے۔

انسان قریباً سو سال کے بعد کیوں خود بخود مرجاتا ہے مکھی چالیس دن کے بعد کیوں مرجاتی ہے۔ کتا دس سال کے بعد کیوں مرجاتا ہے۔ چوہا تین سال کے بعد کیوں مرجاتا ہے۔ یہ موضوع (Science of Cytigenetics) سے تعلق رکھتا ہے اور اس ضمن میں حال ہی میں بڑی دلچسپ ریسرچ ہوئی ہے لیکن موضوع سائنسی قسم کا ہے اس لئے شاید غیر سائنسدان حضرات کے لئے دلچسپی کا باعث نہ بن سکے مختصراً یہ سمجھ لیجیے کہ انسان (Cells) کا مجموعہ ہے اور (Aging Process) یا (Bio morphosis) کا عمل (Cell) بلکہ اس سے بھی نچلی سطح پر ہوتا ہے۔ یہ عمل انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے اور موت تک جاری رہتا ہے۔ (Cell) کا خاصہ یہ ہے کہ ایک سے دو، دو سے چار، چار سے آٹھ میں تقسیم ہونے کا عمل تمام عمر جاری رہتا ہے۔ لیکن جوں جوں انسان کی عمر بڑھتی جاتی ہے (Doubling) یا دُگنے ہونے کے عمل کی رفتار کم ہوتی جاتی ہے۔ اس عمل پر کون کونسے عوامل کارفرما ہیں، جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے یہ خالص فنی موضوع ہے۔ ایک (Theory) یہ ہے کہ (Cell) کا (Nucleic Acid) اپنے (blue prints) بنانے میں غلطیاں کرتا رہتا ہے اور (Cell) کے (Aging Process) کی تہ میں یہی غلطیاں ہوتی ہیں۔ ایک (Free Radical Theory of Aging) ہے۔ اسکے مطابق (Cell) کے آکسیجن کو استعمال کرنیکا عمل (Aging Process) کی بنیاد ہے۔ (Aging Process) کی وجوہات معلوم کرنے کیساتھ ساتھ طبعی عمر کو لمبا کرنے کے تجربے بھی چھوٹے جانوروں پر کئے جا چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں کچھ کامیابی بھی ہوئی ہے اور ممکن ہے انسان کی طبعی زندگی میں بھی ۵ سال تک کا اضافہ کیا جا سکے۔

بہرحال یہ تجربات تو ہوتے رہیں گے اور اگر کوئی مزید انکشافات ہوئے تو ہمیں نکل اجل کتاب کیمطابق پھر غور کرنا ہوگا۔ فی الحال میرا مقصد اجلاً مسمیٰ کے الفاظ قرآنی کی وضاحت ہے۔ نوع انسان کی عمر کی مدت مقرر شدہ ہے بیماریاں اور حادثات صرف (Aging Process) کی وجہ سے لازمی موت کو قریب تر لے آتے ہیں۔

[ طلوع اسلام ۔ واضح رہے کہ اس میں نوع انسان کی طبعی عمر پر بحث کی گئی ہے نہ کہ افراد کی عمر پر۔ ہمارے ہاں جو یہ عقیدہ عام ہے کہ ہر شخص کی عمر پہلے سے متعین ہوتی ہے اور انسان خواہ کچھ ہی کیوں نہ کرے، نہ اس میں ایک دن کی کمی ہو سکتی ہے نہ بیشی، سو یہ عقیدہ صحیح نہیں۔ تفصیل کے لئے پرویز صاحب کی تصنیف، کتاب التقدیر ملاحظہ فرمائیے ]

Islam A Challaenge To Religion

## ( By Parwez )

The very name of the book strikes one as a paradox, for it is universally recognised that Islam is one of the religions of the world. So how could a religion challenge the very institution to which it subscribes? The author has indeed made a successful bid to prove this strange aphorism for the first time in the history of Islamic thought and his research deserves cateful study. It is thought-provoking; it is revolutionary, opening new vistas and bold horizons of intellectual endeavours. It is the outcome of life-long study of one of the renowned Quranic, thinkers of our times.

The author has not, however, taken a purely negative attitude. Having proved his claim that Islam is NOT a religion, he has very lucidly explained what Islam really is, and how it offers the most convincing and enduring answers to those eternal questions which every thinking man asks about the meaning and purpose of life, and how it can be achieved. The book is thus a unique attempt at the rediscovery of Islam.

Scholarly written and exquisitely presented.

**Bound - Rs. 35.00 Paper back - Rs. 20.00**

**( Postage extra )**

*Can be had from:*

**(1) IDARA-E-TOLU-E-ISLAM,**
**25-B, Gulberg II, LAHORE**

**(2) MAKTABA-E-DEEN-O-DANISH**
**Chowk Urdu Bazar, LAHORE**